تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی کا علمی، ادبی، لسانی، فنی و سائنسی جریدہ

جلد03 | شمارہ 3 | ماہ مارچ 2018ء

ایڈیٹر

پروفیسر ایس۔اے۔شکور

ڈائرکٹر / سکریٹری تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی

خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ: ماہنامہ قومی زبان، صدر دفتر تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی، چوتھی منزل، حج ہاؤز، نامپلی، حیدرآباد 001 500 تلنگانہ اسٹیٹ۔ انڈیا

Edited, Printed and Published by Prof. S.A. Shukoor,
Owned by Telangana State Urdu Academy, Minorities Welfare Dept., Govt. of Telangana,
Printed at M/s. Taahaa Print Systems, Flat No. 304-B, Door No. 5-9-189, Lenaine Estate, Abids Hyderabad
Published from 4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad-500 001 Telangana State
**Ph: No.** 040-23237810 Fax: 040-66362931 **Email:** qaumizaban.tsua2015@gmail.com

ماہنامہ

# قومی زبان

| | | |
|---|---|---|
| مدیر | : | پروفیسر ایس اے شکور، ناظم / معتمد تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی |
| ناشر و طابع | : | پروفیسر ایس اے شکور، ناظم / معتمد تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی |
| ترتیب و تزئین | : | محمد ارشد مبین زبیری |
| صورت گری | : | محمد جنید اللہ بیگ |
| سرورق | : | سید مجیب الدین |
| طباعت | : | طٰہٰ پرنٹ سسٹمس، عابڈس، حیدرآباد |
| ماہ | : | مارچ 2018ء |
| جِلد | : | سوم |
| شمارہ | : | ( 3 ) |
| ترسیلی اختیار | : | تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی |
| استحقاق | : | تمام حقوق تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی کی تحویل میں ہیں |
| مبادلہ ماہانہ | : | 15-00 (پندرہ) روپے |
| مبادلہ سالانہ | : | 150-00 (ایک سو پچاس) روپے |

''قومی زبان'' میں شائع شدہ مضامین میں اظہار کردہ خیالات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

# قریـنه


| | | | |
|---|---|---|---|
| ہم کلامی | : | پروفیسر ایس اے شکور | 6 |
| **مضامین:** | | | |
| عزیز احمد کے ناولوں کا اسلوب | : | پروفیسر محمد دانش غنی | 7 |
| فیض احمد فیض کی نظم صبح آزادی | : | ڈاکٹر ضامن علی حسرت | 14 |
| قائد ملت ولسّان امت نواب بہادر یار جنگ | : | ڈاکٹر محمد عظمت اللہ خان احساس | 18 |
| اُردو ادب پر ویدک تہذیب کا اثر | : | ڈاکٹر شیخ عبدالغنی | 23 |
| اُردو نظم کے فنی جہات | : | ڈاکٹر آفتاب عرشی | 29 |
| وقائع نگاری (تاریخ سے پہلے مورخ کو پہچانئے) | : | خورشید احمد | 39 |
| شیخ الاسلام بحیثیت نعت گو شاعر | : | محمد ذاکر حسین | 43 |
| عصمت چغتائی کی رپورتاژ نگاری | : | عبیدالرحمٰن | 50 |
| **گوشه خواتین:** | | | |
| دوہری ذمہ داریوں کا بوجھ (برسرِ روزگار خواتین کے مسائل) | : | سفینہ عرفات فاطمہ | 54 |
| **سائنس و ٹکنالوجی:** | | | |
| ابوالقاسم الزہراوی طبی دنیا کا عظیم ستون | : | محمد خلیل سائنسدان | 58 |
| **انشائیه:** | | | |
| جو بات تیری تصویر میں ہے تجھ میں نہیں | : | اقبال مجید اللہ | 61 |
| **معاشرت:** | | | |
| انسانی اقدار۔ضرورت واہمیت | : | انور ہادی | 65 |
| **طنز و مزاح:** | | | |
| ہماری جو شامت آئی | : | عابدہ محبوب | 68 |
| **افسانه:** | | | |
| کابلی والا (رابندر ناتھ ٹیگور) | : | مترجم: ڈاکٹر اسلم فاروقی | 74 |
| **حصه نظم:** | | | |
| غزلیں | : | ڈاکٹر فاروق شکیل | 79 |
| غزلیں | : | اقبال شیدائی | 80 |
| غزلیں | : | زعیم ذومرّہ | 81 |
| غزلیں | : | ڈاکٹر سمیر کبیر | 82 |


oOo

# ہم کلامی

ماہ مارچ 2018ء کا شمارہ آپ کی خدمت میں پیش ہے۔اس شمارے کو ممتاز ادیبوں' اسکالرس وقلم کاروں کے معیاری مضامین' سائنس وٹکنالوجی' طنز ومزاح' دلچسپ افسانوں اور شعرائے کرام کے کلام سے مزین کیا گیا ہے۔امید کہ یہ نگارشات قارئین کی معلومات اوراُن کی دلچسپیوں میں اضافے کا باعث بنیں گی۔ماہ اپریل علامہ اقبال علیہ الرحمہ کی وفات کا مہینہ ہے'اس نسبت سے اپریل کے شمارے کو علامہ اقبال کے نام معنون کیا گیا ہے۔اس خصوص میں اہل قلم کے مضامین وصول ہورہے ہیں۔

ماہ مارچ تا مئی طلبائے کالج و مدارس کے امتحانات کا سیزن ہوتا ہے۔انٹرمیڈیٹ کے طلباء اپنے امتحانات سے فارغ ہوچکے ہیں۔اِن دنوں دسویں جماعت کے امتحانات جاری ہیں۔مجھے امید ہے کہ انٹرمیڈیٹ کے طلباء نے اپنے اپنے شعبوں کے امتحانات بڑی محنت کے بعد دیئے ہونگے اوران کے بہترین نتائج آئیں گے'اسی طرح دسویں جماعت کے طلباء نے بھی بہت محنت کی ہوگی اورآگے کے منصوبوں کے ساتھ امتحان کی تیاری کی ہوگی۔اس کے ساتھ ساتھ ڈگری کالج کے طلباء بھی اپنے امتحانات کی تیاری میں ہونگے۔میری اُن تمام طلباء سے جو اپنے اپنے درجوں کے امتحانات سے فارغ ہوچکے ہیں' خواہش ہے کہ وہ تعطیلات میں اپنے آئندہ کیریر کیلئے منصوبہ بندی کریں' اپنے خود کے رجحان کو لے کر اپنے اساتذہ اور والدین سے مشورے کریں' اور اگلی تعلیم کے لئے لائحہ عمل تیار کریں۔فرصت کے اوقات میں سیر اور تفریح' کھیل کود ضرور کریں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنے مستقبل کے منصوبوں کے لئے بھی وقت نکالیں۔اپنے فارغ وقت میں سے اپنی مادری زبان اُردو کے لئے بھی وقت نکالیں' اگر آپ کو اردو آتی ہے تو دوسروں کو سیکھانے کی کوشش کریں۔کئی تعلیمی اور ادبی اداروں کی جانب سے گرمائی کلاسس کا اہتمام کیا جاتا ہے جس میں اردو زبان کے سیکھانے کے ساتھ ساتھ اخلاقیات اور دینیات کی تعلیم کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے'ان سے استفادہ کریں۔بہرحال اپنے فرصت کے اوقات کو ضائع نہ کریں۔

تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈیمی اُردو زبان وادب کے فروغ' ترقی وترویج کی اسکیموں کی تکمیل میں مصروف ہے۔حکومت تلنگانہ نے جہاں ریاست بھر میں اردو زبان کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا ہے' وہیں اس زبان کے سرکاری دفاتر میں استعمال کے لئے 66 اردو مترجمین کے تقرر کا کام تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈیمی کے سپرد کیا ہے'اس سلسلہ میں جامع منصوبہ بندی کی جارہی ہے اوران مترجمین کے انتخاب کے لئے ایک تحریری امتحان رکھا جارہا ہے'اس خصوص میں امید ہے کہ بہت جلد اعلامیہ جاری ہوگا۔

پروفیسر ایس اے شکور

ایڈیٹر

پروفیسر محمد دانش غنی
شعبۂ اردو
گوگٹے جوگلے کر کالج، رتناگری - 612 415

# عزیز احمد کے ناولوں کا اسلوب

فکشن میں ناول وہ صنفِ سخن ہے جس کی جان دلنشیں اسلوب ہوتا ہے اور یہی مطالعے کو مہمیز لگاتا ہے۔ بہتر سے بہتر قصہ سامع کو اس وقت تک متوجہ نہیں کرسکتا جب تک اسے دلچسپ، پرتکلف اور موثر انداز میں پیش نہ کیا جائے اور انداز بھی ایسا ہو کہ جو سننے والے کو اپنی طرف کھینچے اور کسی جانب جانے نہ دے۔ ہمارے داستان گو حسنِ بیان کے اس فن سے آشنا تھے اس لئے وہ اَن دیکھی دنیاؤں کے قصے اس خوبصورتی سے سناتے تھے کہ سننے والے اپنی دنیا چھوڑ کر ان کے لفظوں کے جادو سے خیالوں کی دنیا بسا لیتے تھے۔ اچھے ناول نگاروں نے بھی کہانی بیان کرنے کے لئے اپنے اسلوبِ بیان پر ہمیشہ خصوصی توجہ دی ہے اور اپنے ناولوں کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور موثر بنانے کے لئے نئے تجربات سے بھی گریز نہیں کیا۔ اسلوب کے سلسلے میں کئے گئے تجربے نہ صرف ان کے ناولوں کے لئے کامیاب ثابت ہوئے بلکہ اردو ناول کے ارتقا میں بھی ان تجربوں نے خونِ جگر کا کام کیا۔ چنانچہ جب انگریزی ناولوں کے طرز پر اردو میں ناول لکھے جانے لگے تو ان ناول نگاروں نے بھی زبان کے لئے وہی نمونے اپنائے جو نمونے انگریزی ناول نگاروں نے پیش کئے تھے۔ اردو ناول نگاروں نے ان سے یہ بھی اثر لیا کہ اگر مقصدی باتیں اور اصلاحی صورتیں سماج میں پیش کرنی ہیں تو زبان تخلیقی ہو نہ ہو، اسلوبِ بیان عام فہم ضرور ہونا چاہئے' ورنہ مقصدیت اور اثر انگیزی متاثر ہوسکتی ہے۔ شاید اسی لئے انسویں صدی کے اواخر تک ناول میں تشبیہات و استعارات اور صنائع سے عبارت کو سجانے کی کوشش ختم ہوجاتی ہے اور آسان نثر میں باتیں کرنا زیادہ موثر سمجھا جاتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کی زبان اور اسلوب اس کی بہترین مثال ہے۔ نذیر احمد کے بعد رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر اور مرزا ہادی رسوا نے اپنے نکھرے ہوئے شگفتہ اسلوب کو حقیقت پسندی سے ہم آمیز کیا۔ پریم چند نے زبان کی فطرت اور ناول کے لئے معیاری اسلوب کی ضرورت کو زیادہ اہمیت دی اور حقیقت پسندانہ فنی شعور کے ساتھ ناول نگاری کے کاز کو آگے بڑھایا۔ بعد کے فن کاروں نے ان کے اسی اسلوب کو تبدیل کرکے یا موڈی فائے (MODIFY) کرکے حقیقت پسندی کو نئی شکل عطا کی۔ ایسے اہم فنکاروں میں سجاد ظہیر، عزیز احمد،

عصمت چغتائی ، کرشن چندر ، خدیجہ مستور ، جیلانی بانو ، احسن فاروقی ، عبداللہ حسین ، شوکت صدیقی ، حیات اللہ انصاری ، ممتاز مفتی ، علیم سرور ، قاضی عبدالستار اور جمیلہ ہاشمی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں ۔

اردو ادب میں عزیز احمد کی شخصیت بڑی متنوع اور گوناگوں ہے ۔ وہ بیک وقت مترجم ، ناول نگار ، شاعر ، نقاد ، ماہرِ اقبالیات و اسلامیات اور افسانہ نگار کی حیثیت سے بطور خاص جانے اور پہچانے جاتے ہیں ۔ ان کا شاہکار ناول ''ایسی بلندی ایسی پستی'' کا معروف یورپی اردو اسکالر پروفیسر رالف رسل نے انگریزی میں ترجمہ کیا جو ۱۹۷۲ء میں یونیسکو سے شائع ہوا اور اس طرح عزیز احمد عالمی سطح پر معروف اردو فکشن نگار کی حیثیت سے مشہور و مقبول ہو گئے ۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ بنیادی طور پر ناول نگار ہیں ۔ ان کے تقریباً آدھے درجن سے زیادہ ناول شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں ۔ جن میں ''مرمر اور خون (۱۹۴۴ء)''، ''ایسی بلندی ایسی پستی (۱۹۴۸ء)'' ''ہوس (۱۹۵۱ء)''، ''گریز (۱۹۵۵ء)''، ''آگ (۱۹۵۶ء)''، ''جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں (۱۹۶۶ء)'' اور ''مثلث (۱۹۸۵ء)'' قابلِ ذکر ہیں ۔

سجاد ظہیر کے بعد ناول کی دنیا میں عزیز احمد سب سے اہم اور معتبر نام ہے ۔ جن کے ناولوں میں بقول پروفیسر قمر رئیس بے باکی اور ہمواری کے ساتھ ساتھ جذباتی زندگی کی موثر ترجمانی کا ایک ایسا جاندار اسلوب ملتا ہے جسے منٹو نے اپنی کہانیوں میں زیادہ تیکھی اور نکھری ہوئی صورت میں پیش کیا ۔ علامتی اظہار اور شعور کی رَو کی تکنیک سے بے نیازی کے باوجود اس میں بدلتی ہوئی پیچیدہ زندگی ، اس کی ڈرامائیت اور پہلو دار کرداروں کی نفسیاتی کیفیات کو ادا کرنے کی صلاحیت ہے ۔ زندگی کا کوئی رخ ، کوئی واقعہ ہو عزیز احمد ایک خاص فاصلہ سے خاص طرح کی لاتعلقی لیکن قوت کے ساتھ بیان کرنے کی قدرت رکھتے ہیں ۔ اردو میں عام مقبولیت حاصل کرنے والے ناموں میں بالعموم خاص طرح کے واقعات اور جذباتی حالت کو بیان کرنے کے لئے کچھ خاص الفاظ اور اظہارات استعمال ہوتے آئے ہیں ۔ بعض ناولوں میں کچھ کرداروں ، اخلاقی آدرشوں اور نظریوں سے مصنف کی وابستگی اور پاسداری بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے ۔ اس کے نتیجے میں ناول کی فنی ہیئت ہی نہیں اسلوبی ساخت بھی متاثر ہوتی ہے ۔ سنجیدہ قارئین مصنف کی کھلی پاسداری کے اس رویے کو قبول نہیں کرتے ۔ عزیز احمد کا اسلوب ان کوتاہیوں سے پاک ہے ۔ وہ اپنی تخلیقی قوت سے پیچیدہ ذہنی کیفیات اور مخلوط باطنی تجربات کے تجزیے میں نئے اظہارات اور نئی تراکیب تراشتے ہیں ۔ جس کی وجہ سے قاری کو محسوس ہوتا ہے جیسے وہ انسانی نفسیات اور زندگی کی نئی وادیوں کا نظارا کر رہا ہو ۔ ''گریز'' عزیز احمد کا ناول ہے جس میں نعیم نامی ایک کردار خود اپنی نفسیاتی حالت کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتا ہے :

''جب سے میں نے سنا تھا کہ خانم چاہتی ہے اس کی شادی مجھ سے ہو' تب سے بلقیس کی شانِ نارسائی

میں فرق آ گیا تھا۔ کشش کا بہت بڑا باعث یہ تھا کہ میری مفلسانہ طالبِ علمی کے زمانے میں وہ میری پہنچ سے باہر تھیں۔ آئی سی ایس کے انتخاب نے مجھے اتنا اوپر اٹھا دیا کہ میرا ہاتھ اس تک پہنچ سکتا تھا۔ اس سے نا امیدانہ اشتیاق کا خاتمہ ہوگیا۔ اس کی جگہ دلچسپی، لطف اور زیادہ مادی قسم کے جذبات نے لے لی تھی۔''

(گریز، عزیز احمد، ص ۳۴)

پروفیسر قمر رئیس کے مطابق یہ ایک پیچیدہ ذہنی رویے کا حقیقت پسندانہ بیان ہے۔ یہاں لفظوں کی کفالت اور تراش خاص معنی رکھتی ہے۔ اس اقتباس میں شانِ نارسائی، مفلسانہ طالبِ علمی اور ناامیدانہ اشتیاق جیسی ترکیبیں ہی طلسمِ معنی کھولتی ہیں۔

دراصل عزیز احمد کی امتیازی خصوصیت ان کی نفسیاتی بصیرت اور ژرف نگاہی ہے۔ ناول میں جذباتی زندگی کے مدوجذر پیش کرنے میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ وہ نفسیاتی اور جنسیاتی احساسات کو اس قدر فنکارانہ سلیقے سے پیش کرتے ہیں کہ بقول مولوی عبدالحق ان کا قلم مصور کا ''موقلم'' بن جاتا ہے۔ ''گریز'' میں شروع سے آخر تک نعیم کی داخلی اور نفسیاتی حالت قاری کے سامنے رہتی ہے۔ ساتھ ساتھ خارجی زندگی کی وہ تمام باتیں جو نفسیاتی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں وہ بھی ناول میں بڑی عمدگی کے ساتھ دکھائی گئی ہیں۔ ہر لمحہ قاری کے سامنے نعیم کی جذباتی اور ذہنی کیفیت رہتی ہے اور وہ اس کی پیش کش میں عزیز احمد کے کمال کا اعتراف کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ مثلاً درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیں

''جب نعیم آئی سی ایس ہوگیا اور ایک بڑے عہدے پر مامور ہے مگر قومی و بین القوامی حالات کے سامنے اس کا حساس ذہن بری طرح کشمکش میں مبتلا ہے۔ نعیم نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کی شخصیت ٹوٹ رہی ہے۔ انفرادیت مندمل ہو رہی ہے۔ سیاست میں اس کا نقطۂ نظر محض ایک تماشائی کا سا رہ گیا ہے۔ ہندوستان آنے کے کچھ ہی دنوں بعد کانگریس اور لیگ کی جنگ میں اس کی نام نہاد اشتمالیت ختم ہوئی۔ سرکار سے اسے کوئی ہمدردی نہ تھی اس لئے سرکار کا آدمی بن کے چمکنے کا اسے کوئی موقع نہ تھا۔ اس طرح خارجی سیاست میں بھی اس کی ہمدردی نہ تھی۔ ذہنی تفکرات میں امتزاج کے فقدان کی وجہ سے وہ کوئی فلسفۂ حیات نہ بنا سکا اور اچھا بھی تھا۔ سرکاری ملازمین کو اس کی ضرورت بھی کیا ہے؟ سیاست میں اشتمالیت اور اسلام کے درمیان وہ کوئی قطعی فیصلہ نہ کر سکا تھا۔ پہلے بھی خیالات بے ارادہ بے عمل تھے اور اب بھی رہے۔ جذباتی امتزاج کی بجائے انتہا درجہ کا انتشار تھا۔''

(گریز، عزیز احمد، ص ۲۸۷)

''گریز'' میں عزیز احمد نے خارجی و داخلی زندگی کے بے شمار پہلو پیش کئے ہیں۔ انہوں نے خالص جنسی وابستگی کو بھی پیش کیا ہے۔ جنسی محبت کو بھی اور روحانی محبت کو بھی۔ یورپ کی سماجی زندگی بھی پیش کی ہے اور سیاسی زندگی بھی۔ جنگِ عظیم کے خوف کو بھی پیش کیا ہے اور خارجی ہیجان کو بھی۔ زندگی کی بے کیفی کو بھی پیش کیا ہے اور اس کی غیر یقینی حالت کو بھی۔ ذہنی زندگی بھی پیش کی ہے اور نفسیاتی زندگی بھی۔ غرض زندگی کے اتنے اور بے شمار پہلو اتنے بھرپور طریقے سے پیش کرنا نہ صرف ان کی زندگی سے گہری واقفیت کو ظاہر کرتا ہے بلکہ اس سے ناول نگاری کی

تکنیک اور اسلوب پر ان کی غیر معمولی قدرت بھی نمایاں ہوتی ہے۔انہوں نے ناول میں جہاں جیسی ضرورت پڑی ویسا ہی انداز اختیار کیا ہے تاکہ مواد مکمل اور بہتر طریقے سے ظاہر ہو سکے۔زندگی کے مختلف اور متضاد گوشوں کو پیش کرنے کے لئے انہوں نے ناول نگاری کے مختلف طریقوں سے استفادہ بھی کیا ہے۔اس لئے ''گریز'' میں خطوط بھی ملتے ہیں، ڈائری بھی اور تاثراتی اسلوب بھی۔ انہوں نے مختلف تکنیکوں اور اسالیب کا استعمال کر کے اپنے مواد کا مکمل ترین اظہار کیا ہے۔

عزیز احمد کا ایک اور ناول ''ایسی پستی ایسی بلندی'' کو سنجیدہ اور اہم ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔اس ناول میں زندگی کا گہرا مطالعہ کیا گیا ہے۔اس میں راست انداز سے فسادات یا ہندوستان کی تقسیم کو موضوع نہیں بنایا گیا مگر اس ناول میں ایک دور کے مٹنے اور ایک تہذیب کے ختم ہونے کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔آزادی کے بعد چونکہ ہم ایک نئی دنیا میں داخل ہو رہے تھے اس لئے اس ناول میں مصنفین نے گزشتہ دنیا کو بھی ایک بار پلٹ کر دیکھا ہے جو مٹ رہی تھی اور بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہی تھی۔گزشتہ زندگی اور موجودہ کشمکش کی بھرپور اور حقیقت پسندانہ پیش کش ہی اس ناول کی بیش قیمت بنیاد ہے۔

''ایسی پستی ایسی بلندی'' عزیز احمد کے فکر و فن کی پختگی کا عمدہ ثبوت ہے۔یہ صرف چند افراد کی داستان نہیں بلکہ ایک خاص طبقے کی کہانی بھی ہے، حیدرآباد کے امیر طبقے اور ان کی اجتماعی زندگی کی تصویر کشی اس سے پہلے اتنی کامیابی سے کہیں اور نہیں کی گئی تھی۔یہ مصنف کے سب سے گہرے اور سب سے طویل مشاہدے کا نچوڑ ہے۔اس میں ایک بہت وسیع کینوس پر زندگی کی تبدیلیوں کی تصویر پیش کی گئی ہے۔یہ ایک دور کی، ایک تمدن کی اور ایک تہذیب کی تاریخ ہے۔

عزیز احمد ناول نگاری کے اہم ترین فن سے واقف تھے اس لئے وہ اپنے مواد کے لئے کسی مخصوص ہیئت یا فارم کی پیروی نہیں کرتے بلکہ اپنا الگ انداز اختیار کرتے ہیں۔شاید اسی لئے ''ایسی بلندی ایسی پستی'' میں ''شعور کی رَو'' سے لے کر ہمہ دان مصنف تک کہانی بیان کرنے کے جتنے طریقے ہو سکتے ہیں ان سب کو انہوں نے ہر ممکن طریقے سے زندگی کے زیادہ سے زیادہ گوشے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ناول کا ہر حصہ زندگی سے لبریز ہے اور زندہ، متحرک اور سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ ''ایسی بلندی ایسی پستی'' کو جاندار اور زندہ ناول بنانے میں اس سادہ اور رواں نثر نے بھی خاصا اہم کردار ادا کیا ہے جس میں عجیب سی رچاؤ کی کیفیت ہے اور جس کی سادہ تصویر کشی میں بھی بڑی موثر کشش ہے۔اس زمانے میں بیانیہ تو تمام کیفیت و حرکات کا وسیلہ ہوتا ہی تھا مگر عزیز احمد کا بیانیہ پریم چند کے برعکس تھوڑا مختصر اور جامع ہوتا ہے جسے پڑھ کر ذہن میں چست اور جامع عبارت کا خیال آتا ہے۔ مثلاً یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''فرنیٹر میل بہت دیر سے پہنچی۔ جنگ اب ۱۹۴۵ء کی منزل میں تھی۔۔۔دم توڑ رہی تھی، جرمنی کی ہار ہو چکی تھی۔جاپان کی شکست باقی تھی اور امریکن سپاہی اور افسر ہزاروں کی تعداد میں ہندوستان پر چھائے ہوئے تھے۔ ویک اینڈ پر آئی لڑکیاں اپنے یونیفارموں میں ٹہل رہی تھیں۔ ایک ایک ڈبے میں خواہ فرسٹ ہو، خواہ سیکنڈ ہو، انٹر ہو یا

ٹھرڈ مسافر چھت تک ٹھسے ہوئے تھے ۔ بڑی مشکل سے رشیدہ اور فاطمہ کو راولپنڈی سے دہلی تک ایر کنڈیشنڈ کوپے ملا تھا۔''

(ایسی بلندی ایسی پستی، عزیز احمد، ص ۳۳۹)

اس ایک اقتباس میں چھوٹے چھوٹے فقروں کے سہارے قصے کی سبک رفتاری کا واضح اندازہ ہوتا ہے۔ جنگ کے حوالے سے عالمی صورتِ حال، امریکیوں کا ہندوستان پر چھایا ہوا ہونا اور عام مسافروں کا ڈبوں میں ٹھسا ہونا، اس صورتِ حال کو واضح کرتا ہے کہ اس وقت زندگی میں اتھل پتھل پائی جاتی تھی۔ اس طرح ایک پلیٹ فارم کے منظر کے حوالے سے بیانیہ میں کتنی باتیں بغیر وحدتِ تاثر کو متاثر کئے ہوئے سامنے آجاتی ہیں۔

عزیز احمد الفاظ کے ذریعے انسانی جذبات و احساسات کو پیش کرنے میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے۔ وہ ایسے احساسات کو بھی ادا کردیتے ہیں جہاں زبان بھی پوری طرح ساتھ نہیں دیتی۔ مثلاً انہوں نے سلطان حسین اور نور جہاں کی ازدواجی زندگی کو پیش کرتے ہوئے جس طرح ان دونوں کے احساسات و جذبات کو پیش کیا ہے اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ بقول ڈاکٹر یوسف سرمست:

''ان دونوں کے تعلقات کی کشیدگی کو بڑھتے ہوئے دکھانا اور آخر میں رفتہ رفتہ اسی خلیج کا خلع کی صورت اختیار کرنا عزیز احمد کے فن کے کمال کو ظاہر کرتا ہے۔''

(بیسویں صدی میں اردو ناول، ص ۸۷)

اردو ناول نگاری میں شاید ہی آج تک کسی نے اس قدر فطری انداز سے ازدواجی زندگی کی کشیدگی کو پیش کیا ہو۔ مثلاً درج ذیل اقتباس ملاحظہ کیجئے جب زبانی تکرار کے بعد سلطان حسین نور جہاں کو مار بیٹھتا ہے اور نور جہاں کے جذبات ایک عجیب سا رخ اختیار کرلیتے ہیں:

''نور جہاں کے اندر کوئی چیز آگ کی طرح سلگ کر بجھ گئی۔ غصے کی بجائے رنج، ذلت اور بے بسی کا ایسا تلخ احساس جو اس نے اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ ایک عجیب انکشاف تھا جس سے اس کی ہستی مندروں کی سب سے نیچی تہہ کی طرف بہہ گئی، یہ کہ اسے کوئی مار سکتا ہے اور اسے کوئی ذلیل کرسکتا ہے۔ ایک ایسا نیا تجربہ جس کا ذکر ہی سن کر اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے۔ اس نے سوچنا بند کردیا۔ چند منٹ تک وہ بالکل خلا کے عالم میں تھی۔ ہر چیز مفقود تھی۔ وہ خود سلطان حسین، خورشید زمانی بیگم، وہ بچہ جو ابھی اس کے پیٹ میں تھا۔ ہر چیز مفقود تھی۔ ایسا خواب جو دیکھا جاچکا ہو اور محو ہوچکا ہو، صرف اس کی یاد سی باقی ہو۔ اب صرف کسک ہی کسک تھی۔ تھپڑ اس کے گال، اس کے بھیجے، اس کے دل پر ضرب لگاتا ہوا اس کی روح کو مفلوج کرچکا تھا۔ اب اس کی پوری روح سسکیوں میں منتقل ہوچکی تھی۔ اس کی حالت ایسی تھی جیسے کسی کو ابھی ابھی موت آئی ہو۔''

(ایسی بلندی ایسی پستی، عزیز احمد، ص ۱۸۹)

عزیز احمد انسانی جذبات اور احساسات کی سچی اور بھرپور عکاسی کرتے ہیں جس کو صرف چند اقتباسات سے نمایاں نہیں کیا جاسکتا۔ ناول کا پورا ماحول اور پوری فضا ان کی جذبات نگاری کو موثر اور فطری بناتی ہے۔

ناول کے مکالمے بھی جذباتی کیفیتوں کی عکاسی میں بڑا تعاون کرتے ہیں۔ یہ مکالمے گہرائی کا تاثر دیتے ہیں اور کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ خاص طور سے ڈرامائی

صورتِ حال کی عکاسی میں یہ مکالمے بہت کام آتے ہیں جن میں خفیف سا طنز بھی ہوتا ہے اور زندگی کی تلخ سچائی بھی۔ ان اقتباسات پر نظر ڈالیئے:

''تم بھی گئی تھیں؟'' سلطان حسین کا چہرہ دفعتاً سخت ہوگیا۔

''کیا نہیں جانا چاہئے تھا؟''

''نہیں کیوں نہیں۔ ضرور جانا چاہئے تھا اور میاں جب دورے پر گیا ہوتو اور بھی ضرور جانا چاہئے تھا۔''

''میں نے تو جانے سے انکار کردیا تھا۔ یہی کہا تھا کہ سلطان یہاں نہیں ہیں، میں نہیں آؤں گی۔ مگر کلثوم نے کسی طرح پیچھا نہیں چھوڑا، آ کے مجھے خود ساتھ لے گئی۔''

''کتنی خوشی کی بات ہے؟ میری بیوی سوسائٹی میں اتنی ہر دل عزیز ہوتی جارہی ہے۔ میرے ہونے نہ ہونے سے کیا ہوتا ہے ڈارلنگ۔ شوہر تو اسی لئے ہوتے ہیں کہ کمائیں، محنت کریں اور بیوی کو اس لئے اپنی کمائی لاکر دیں کہ وہ سوسائٹی میں دوسروں کے ساتھ مٹکتی پھرے۔'' اور پھر سلطان حسین نے تلے ہوئے آلو چبانا شروع کردیئے۔

(ایسی بلندی ایسی پستی، عزیز احمد، ص ۱۸۷)

''چپ حرامزادی۔'' سلطان حسین نے میز پر اس زور سے بھنچی ہوئی مٹھی ماری کہ پیالی سے چھلک کے چائے پالش کی ہوئی میز پر گری اور وہاں ایک داغ سا پڑ گیا۔

''تو ہوگا حرام زادہ، ذرا زبان سنبھال کے بات کر، مجھ کو اپنی لونڈی سمجھ لیا ہے، خود تو چھٹا ہوا آوارہ بدمعاش ہے اور الٹا ہر وقت میری جان کے پیچھے پڑا رہتا ہے۔''

(ایسی بلندی ایسی پستی، عزیز احمد، ص ۱۸۸)

ان مکالموں سے پورے ناول کی فضا کی بازیافت بھی ہوجاتی ہے اور قاری کو یہ مکالمے پوری طرح اپنی گرفت میں رکھنے کی طاقت بھی رکھتے ہیں۔ مکالموں کی زبان طنزیہ طور پر حیدرآباد کی زوال پذیر سوسائٹی سے متعلق اونچے طبقے کی اس گفتگو کو آشکار کرتی ہے جس کا تبادلہ گھر کے اندر ہوتا ہے لیکن مصنوعیت اور ریاکاری اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب کلبوں اور مخلوط محفلوں میں یہ طبقہ اپنے آپ کو اعلیٰ تہذیبی قدروں کا نگہبان ثابت کرتے ہوئے مہذب الفاظ استعمال کرتا ہے۔

عزیز احمد نے اس ناول میں اپنے فلسفیانہ خیالات کو بھی دوسرے کرداروں کے ذریعہ بڑے نپے تلے انداز میں پیش کیا ہے۔ سریندر کی خود کلامی مصنف کے فلسفۂ وجودیت کا کھلا اظہار ہے۔ جہاں انہوں نے ''شعور کی رو'' کی تکنیک کا استعمال کرکے اور آزاد تلازمِ خیال کے اصول کو کام میں لاکے زندگی اور وقت کی ہیئت کو لوگوں کے دلوں میں بٹھانا چاہا ہے۔ سلطان حسین کی موت پر سریندر کا ذہن کہتا ہے:

''بہتا ہوا پانی، دریا، سمندر، وقت لیکن تخیل زندگی کا وہ نام ہے اور زندگی وقت کے دریا کی مسخری ہے اور وقت جو ساری دنیا کا احتساب کرتا ہے وہ بھی رکتا رہے گا۔ یوں کہا شیکسپیئر نے اور بہت سے ماہرینِ طبیعات نے، زندگی وقت کے دریا کی مسخری ہے۔ میں، تم، سلطان حسین۔ میری ابتداء میں میری انتہا ہے۔ پیدائش، افزائشِ نسل اور موت سب کے سب بے معنی ہیں کیونکہ متوسط طبقہ کا دریا بہتے ہوئے پانی، بپتسمہ کے چھینٹے، زنار کے دھاگے اور تسبیح کے دانے پر یقین نہیں رکھتا۔''

(ایسی بلندی ایسی پستی، عزیز احمد، ص ۲۶۰)

یہ وجودیت کا فلسفہ ہے جو کسی قدر پر یقین نہیں

رکھتا۔ یہ جدید حالات کی دین ہے جس کی وجہ سے تمام پرانی قدریں مسمار ہوگئیں ۔ اسی لئے اپنا وجود اور اپنی زندگی ہی انسان کے لئے سب کچھ ہے ۔ سریندر کے شعور کی رو کے ذریعہ عزیز احمد نے اپنے عہد کے ایک اہم فلسفیانہ رجحان کو بے حد عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کا کمال ہی یہ ہے کہ انہوں نے اس ناول میں فلسفیانہ خیالات سے لے کر مزدوروں کی محنت تک زندگی کے ہر پہلو کو اس کے اصلی رنگ، اصلی آواز اور اصل لہجے میں پیش کیا ہے ۔ یہ لہجہ اور اسلوب ناول کو گہرائی اور قاری کو شعور عطا کرتا ہے اور اسی سے زندگی کی بصریت بھی پھوٹتی ہے۔ اسلوب کے اعتبار سے عزیز احمد کا تاریخی ناول ''جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں'' بھی قابلِ ذکر ہے جس میں انہوں نے موضوع کی مناسبت سے اظہار کا نیا تجربہ کیا ہے۔ ناول کا موضوع تیمور لنگ کی حیات ہے۔ اس لئے اس میں نہایت ہنرمندی اور مہارت سے تاریخوں، تذکروں اور داستانوں کے اسالیب کی آمیزش کی گئی ہے۔ یہ آمیزش اگرچہ ارادتاً کی گئی ہے جو تصنع اور بناوٹ کا احساس بھی کراتی ہے مگر ناول نگار جن تاریخی حقائق اور جس ماحول کی تصویر کشی کرنا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنے اسلوب کو تاریخی اور داستانی اندازِ بیان سے ہم آہنگ کرتا۔ اس طرح اس ناول کا اسلوب موضوع کی مناسبت سے ایک منفرد شناخت بن کر ابھرتا ہے۔

مختصر یہ کہ عزیز احمد نے اپنے ناولوں میں شہر کی پیچیدہ طبقاتی زندگی کے جذباتی اور ذہنی انتشار، مشرق و مغرب کے تہذیبی تصادم اور متوسط طبقے کی بدلتی ہوئی نفسیات کو بڑی بے باکی اور ژرف نگاہی سے پیش کیا ہے۔ وہ اپنے مزاج اور فن کے ساتھ زندگی اور انسانوں کے مسائل سے بے حد قریب تھے۔ اس لئے ان کے ناولوں کا اسلوب اپنی فکری اور فنی صورتوں کے ساتھ اثر انداز ہوتا ہے اور پھر واقعات غیر ارادی طور پر بہتے چلے آتے ہیں۔ ان کے بیشتر ناولوں میں اس وقت کی زندگی اپنے تمام اتار چڑھاؤ کے ساتھ دکھائی دیتی ہے جس سے زبان کے تخلیقی استعمال کے بھی نئے رخ اور نئے زاویے سامنے آتے ہیں جو عزیز احمد کے اسلوب کا پتہ دیتے ہیں۔ عزیز احمد نے اردو ناول کو اجتماعی شعور، نفسیاتی بصیرت اور نئی جہت سے روشناس کرایا ہے۔ ان کے ناولوں میں رومان و حقیقت کا حسین امتزاج ملتا ہے ۔ اس کے علاوہ وسیلۂ اظہار کی ندرت اور بیان کی جدت بھی قاری کو متاثر کرتی ہے۔ ان کے یہاں تکنیک اور ہیئت کے نئے تجربے بھی ملتے ہیں ۔ مغربی ادب کے مطالعے نے انہیں وسیع النظر بنا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اسلوب میں نیا رنگ و آہنگ جھلکتا ہے جسے ہم ان کے فن کا ایک امتیاز کہہ سکتے ہیں۔

☆☆☆

کتابیات:


۱ بیسویں صدی میں اردو ناول، ڈاکٹر یوسف سرمست ترقی اردو بیورو، نئی دہلی۔

۲ گریز، عزیز احمد، موڈرن پبلیشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔

۳ ایسی بلندی ایسی پستی، عزیز احمد، موڈرن پبلیشنگ ہاؤس، نئی دہلی

۴ اردو ناول کے اسالیب، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، تخلیق کار پبلشر، نئی دہلی

۵ ماہنامہ اردو دنیا، نئی دہلی، فروری ۲۰۱۵ء


☆☆☆

ڈاکٹر ضامن علی حسرتؔ
مکان نمبر 9-16-60
احمد پورہ، نظام آباد (تلنگانہ اسٹیٹ)

# فیض احمد فیضؔ کی نظم ''صبح آزادی''

فیض احمد فیضؔ 13 رفروری 1911ء کو سیالکوٹ (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ فیضؔ کی ابتدائی تعلیم مشن اسکول سیالکوٹ میں ہوئی۔ لاہور سے انگریزی اور عربی میں ایم۔اے کامیاب کیا اور امرتسر کے ایک کالج میں انگریزی کے لکچرار کے طور پر اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ کراچی میں مستقل طور پر سکونت اختیار کی۔ صحافت سے وابستہ ہوئے، پاکستان کے اخبارات ''امروز'' اور ''پاکستان ٹائمز'' کے ایڈیٹر بن گئے۔ فیض احمد فیضؔ نے لندن کی ایک خاتون ایلس سے شادی کی۔ 1948 میں میجر جنرل اکبر خان نے انھیں ''راولپنڈی سازش'' کیس میں ملوث کر کے جیل میں بند کر دیا۔ الزامات ثابت نہ ہوسکے تو انھیں رہا بھی کر دیا گیا۔ لیکن ان کی زندگی کے چار سال برباد ہوگئے۔ حکومت روس نے انھیں ''آرڈر آف لینن'' جیسے اعلیٰ سرکاری اعزاز سے نوازا۔ اِن کے شعری مجموعوں میں ''نقشِ فریادی''، ''دستِ صبا''، ''زندہ نامہ''، ''دستِ تہہ سنگ'' اور ''شام شہرِ یاراں'' قابل ذکر ہیں۔ فیضؔ کا انتقال 1982ء میں پاکستان میں ہوا۔

فیضؔ کا شمار بنیادی طور پر ترقی پسند شعراء میں ہوتا ہے اِن کی شاعری ترقی پسندانہ عناصر اور انقلابی رجحانات بہت زیادہ محسوس کئے جاتے ہیں۔ فیضؔ علاّمہ اقبال کے بعد ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اُردو شاعری کو ایک نئی راہ دکھائی اور ایک نیا موڑ دیا۔ ویسے تو فیضؔ اپنی شاعری کی ابتداء اپنے ہمعصر شعراء کی طرح غزل گوئی سے کی۔ لیکن غزل گوئی میں اِن کا جی نہ لگا اور اُنھوں نے اپنے جذبات و احساسات کی ٹھوس ترجمانی کے لئے نظم کے میدان کو چُنا۔ اور اپنی اچھوتی طرز فکر اور ندرت بیان سے اپنے لئے ایک نئی راہ تلاش کر لی اور نظم گوئی کے اس میدان نے فیضؔ کو صدی کے مقبول شعراء کی فہرست میں لا کر کھڑا کر دیا۔ اپنی شاعری میں اکثر وہ محنت کش طبقہ کے حمایتی بن کر معاشرے کے متمول و دولت مند لوگوں پر اِس بات کا زور دیا کرتے تھے کہ اپنی دولت غریبوں اور مستحقوں میں برابر بانٹ دیں تا کہ سماج کا غریب اور محنت کش طبقہ بھوکا اور ننگا نہ رہ سکے۔ فیضؔ کا دلکش اُسلوب انقلابی و جذباتی باتوں کو بھی رومانی و عشقیہ بنا دیا کرتا تھا۔ ان کی شاعری میں کہی ہوئی انقلابی و جذباتی باتیں بھی قارئن کو حسن و عشق کی باتیں محسوس ہوتی تھیں۔ دیگر شعرائے کی طرح ان کے یہاں جوش و خروش اور

گھن و گرج نہیں ملتا لیکن ان کے اشعار میں ایک دھیمی اور ملائم آنچ اور ایک سلگنے والی کیفیت ملتی ہے۔فیض احمد فیض کی کئی شاہکار نظمیں ایسی ہیں جنھیں کلاسکی نظموں کا درجہ حاصل ہے۔ مثلاً ''غبارِ خاطر''، ''محفل ٹھر جائے''، سوچنے دو''، ''ایک چنان کیلئے'' کتبہ، ''سال گرہ''، ''دلدار دیکھنا''، ''لہو کا سراغ''، ''غم نہ کرغن نہ کر''، ''سپاہی کا مرثیہ''، ''نوکِ شمشیر''، ''خورشید محشر کی تو'' اور ''صبح آزای'' اُردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔فیض کے کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اِن کی نظموں پر غزل کی چھاپ نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔فیض اپنی نظموں میں غزل سے اپنا دامن بچا نہ سکے۔ اِن کی بہت ساری نظموں میں اکثر ''بند'' قافیوں سے لیس ہوتے ہیں۔فیض احمد فیض کی بعض نظموں کو سن کر جی چاہتا ہے کہ انھیں ساز پر گایا جائے تاکہ نظموں کا لطف دوبالا ہوجائے۔زیرِنظر مضمون میں ہم فیض احمد فیض کی لازوال وحسین نظم ''صبح آزادی'' پر گفتگو کریں گے۔فیض کی نظم ''صبح آزادی'' کا پہلا بند ملاحظہ کریں ؎

یہ داغ داغ اُجالا' یہ شب گذیدہ سحر
وہ اِنتظار تھا جس کا' یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں' جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شبِ دست موج کا ساحل
کہیں تو جاکے رُکے گا سفینۂ غمِ دل

ooo

فیض اپنی نظم ''صبح آزادی'' کے پہلے بند میں خاصے مایوس اور دُکھی نظر آتے ہیں۔فیض کو جس آزادی کا شدت سے انتظار تھا وہ آزادی ان کو نہیں ملی وہ آزادی جو کہ کٹھن محنت اور قربانیوں کے بعد نصیب ہوتی ہے۔اس بند میں شاعر کو جو آزادی حاصل ہوئی ہے وہ اُس سے مطمئین نظر نہیں آتا۔شاعر کو اس آزادی کا اُجالا داغ داغ اور میلا نظر آرہا ہے۔اور یہ آزادی کی صبح بھی بالکل اجنبی اور غیر مانوس سے لگ رہی ہے۔شاعر کو اس آزادی کی صبح میں ایک قسم کی گھٹن اور بے چینی کی کیفیت محسوس ہو رہی ہے۔جبکہ آزادی ہر شخص کا خواب ہوا کرتی ہے۔لیکن ایک جدوجہد بھری رات کو جب دشت میں کاٹنا پڑتا ہے تو اس تکلیف دہ احساس کو وہی انسان محسوس کر سکتے ہیں جنھوں نے آزادی حاصل کرنے کے لئے ان سارے کٹھن اور مشکل سے بھرے مراحل کو بھگتا ہو۔اور اِن نامساعد حالات میں بھی صبر کا دامن تھامے رکھا ہو۔ان تمام قربنیوں، کھٹنائیوں اور مشکلوں کے بعد صاف ستھری آزادی نصیب نہ ہو تو پھر ایسی آزادی کا کیا مطلب رہ جاتا ہے۔اسی میلی کچیلی آزادی سے تو شاعر کی نظر میں غلامی بہتر نظر آتی ہے۔فیض اپنی نظم ''صبح آزادی'' میں واحد متکلم ہیں۔فیض ساری باتیں خود سے کہہ رہے ہیں۔فیض کے سامنے کوئی دوسرا بندہ موجود نہیں ہے۔فیض کی اس نظم کے پہلے بند کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بند نظم سے زیادہ غزل کا بند نظر آتا ہے۔اس بند میں فیض قافیوں کا خاص خیال رکھا۔مثلاً پہلے شعر کا قافیہ ''سحر'' ہے۔ دوسرے شعر کا قافیہ ''تو نہیں'' ہے۔تیسرے شعر کا قافیہ ''لے کر'' ہے۔چوتھے شعر کا قافیہ ''موجود نہیں ہے۔پانچویں شعر کا قافیہ ''منزل'' ہے۔چھٹے شعر کا قافیہ ''منزل'' ہے اور ساتویں شعری کا

قافیہ ''دِل'' ہے۔ ان ساری باتوں سے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ فیضؔ نظم کے پہلے بند میں غزل کی طرح قافیہ پیمائی کی ہے جس سے نظم کے لطف میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

فیض احمد فیضؔ کی نظم ''صبح آزادی'' کا دوسرا بند:۔

''جواں لہو کی پُراسرار شاہراہوں پر
چلے جو یادِ تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے
دیارِ حُسن کی بے صبر خوب گاہوں سے
پکارتی رہیں بانہیں بدن بلاتے رہے
بہت قریب تھا حسینانِ نور کا دامن
سُبک سُبک تھی تمنا دبی دبی تھی تھکن

ooo

فیضؔ اپنی نظم کے دوسرے بند میں آزادی کے متوالوں سے مخاطب ہیں حالانکہ فیضؔ کے سامنے کوئی بھی موجود نہیں ہے۔ فیضؔ کہتے ہیں جذبات واحساسات کا اُبال دراَصل جوان لہو کی پراسرار شاہراہ ہے۔ پراسرار اس لئے کہ جوش سے بےخبر حرکت وعمل پر اپنا مکمل ایقان رکھتا ہے۔ اور راہ میں آنے والی ہر مشکل اور ہر قربانی کیلئے تیار رہتا ہے۔ اس کے باوجود کچھ وابستگیاں اور ذمہ داریاں قربانی کو ضائع کردیتی ہیں۔ ان تمام مشکلوں اور کٹھنائیوں کے باوجود راحتوں کی خوابگاہوں کو کلفتوں کا تصور بےصبر بنادیتا ہے۔ لیکن یہ تو سحر کو عروسِ جان کر اس کے چہرے سے گھونگھٹ اُٹھانے کے لئے بےچین تھے۔ اور سحر کی لگن اور حسینان نور کے دامن میں کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ جو کہ بڑا مشکل اور جان لیوا کام تھا۔ فیضؔ نے نظم کے دوسرے بند میں بھی قافیوں کا خاص خیال رکھا مثلاً شاہراہوں کا قافیہ ''خواب گاہوں'' ہے۔ اور ''سحر'' کا قافیہ ''نُور'' ہے۔ نظم کے دوسرے اور ساتویں شعر کو فیضؔ نے قافیوں کی بندش سے آزاد رکھا۔ یہ بات بڑی ہی غورطلب ہے کہ فیضؔ نے قافیوں کو اپنی نظم میں اس خوبصورتی سے باندھا ہے کہ یہ نظم نظم ہوتے ہوئے بھی ایک خوبصورت غزل لگتی ہے۔ ایک ایسی غزل جسے ساز پر گایا جاسکتا ہے۔ فیض احمد فیضؔ کی بیشتر نظموں کی خاصیت یہ ہے کہ انھیں ایک خوبصورت آواز کے ساتھ ساز پر گایا جاسکتا ہے۔ نظمیں بامعنی ومقصدی ہیں لیکن شاعر اُنھیں خشک روکھے انداز میں لکھے گا تو قارئین کو اُس میں زیادہ لطف نہیں آئے گا۔

فیض کی نظم ''صبح آزادی'' کا تیسرا بند:۔

سُنا ہے ہوبھی چکا ہے فراق ظلمت ونُور
سُنا ہے ہوبھی چکا ہے وصال منزل وگام
بدل چکا ہے بہت اہلِ درد کا دستور
نشاط وصل حلال و عذاب ہجر حرام
جگر کی آگ، نظر کی اُمنگ، دل کی جَلن
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اَثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگار صباء کدھر کو ئی
ابھی چراغ سرِ راہ کو کچھ خبر ہی نہیں

ooo

فیضؔ اپنی نظم کے تیسرے بند میں کہتے ہیں کہ آزادی کا نُور پھیل چکا ہے۔ سپاہیوں کے دندناتے قدم بالاخر آزادی کی منزل تک پہنچ ہی گئے۔ آزادی کے اِس کھیل میں سنبھل کر ٹھیر کر چلنے والوں کا دستورِ حیات بدل گیا۔ کیونکہ ان کی

سوچ مکمل طور پر بدل چکی تھی۔ نشاطِ وصل (آزادی کی خوشی) ان کے لئے حلال بن چکی تھی اور عذابِ ہجر (آزاد ہندوستان) میں درپیش مسائل کے حل کو حرام مان لیا گیا۔ حرام اور حلال کی یہ کیفیت بالکل ویسی ہی تھی کہ نام زنگی بر عکس نہند کافور ظاہر ہے جب خرد کو جنوں اور جنوں کو خرد سمجھا جائے گا تو یقینی طور پر زندگی کا توازن بگڑے گا۔ بعض دفعہ اِنسان کی بے حسی اس قدر شدید ہوتی ہے کہ جگر کی آگ نظر کی اُمنگ اور دِل کی جلن کو وہ چارۂ ہجر تصور نہیں کرسکتا۔ جس طرح سرِ راہ جلنے والے چراغ کو ہوا کی سمت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اِسی طرح مفت میں آزادی پانے والوں کو آزادی کی قدر و قیمت کا اندازہ نہں ہوتا۔ انہیں کیا معلوم کہ اس آزادی کے لئے کتنے آزادی کے متوالے پھانسی کے پھندے پر جھول گئے۔ کتنے ننھے معصوم لوگوں نے اپنی جانوں کی قربانی دی ہے۔ فیضؔ نے اپنی نظم کے تیسرے بند میں قافیوں کو تو نہیں باندھا لیکن سارے ہی شعر غزل کا رنگ لئے ہوئے ہیں۔ فیضؔ ہمیشہ سے ہی اپنے مزاج کی شاعری کے قائل رہے ہیں۔ وہ اپنے ہمعصر شعراء کے برعکس اپنی نظروں کو بھی غزل کے قالب میں ڈھالتے تھے۔ اِسی وجہہ سے انکی نظمیں ایک عام قاری کی سمجھ میں بھی بڑی آسانی سے آجایا کرتی تھیں۔ اپنی نظم کے تیسرے بند میں فیضؔ نے آزادی کی تڑپ اور آزادی کی قیمت پر نہایت ہی چابکدستی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ اور زبان اور بیان کا خاص خیال رکھا ہے جسکی وجہہ سے یہ نظم ایک شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔

فیضؔ کی نظم کا چوتھے اور آخری بند کے تین مصرعے:۔

ابھی گرانیِ شب میں کمی نہیں آئی
نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

فیضؔ نے اپنے آخری بند میں اپنی نظم کا اختتام صرف تین شعر لکھ کر کردیا۔ حالانکہ مزید اشعار کی گنجائش تھی۔ بحرحال شاعر اپنی مرضی کا مالک ہوتا ہے اور وہ اپنی تخلیق کے لئے آزاد ہے۔ فیض نے اپنی نظم ''صبح آزادی'' کے آخری بند میں آزادی پالینے والے لوگوں سے کہا ہے کہ اے لوگو اگر تم آزادی پالینے کے اس راز کو نہ سمجھ گے تو تمہیں گرانیِ شب کا احساس کیسے ہوگا؟ اور کیوں ہوگا؟ دیدۂ دل اندھیرے پر اُجالے کا دُھوکہ کھا جائیں گے۔ اندھیرے میں کسی طرح بصیرت کام کرے گی۔ ہم جہاں کھڑے ہیں وہاں اگر اندھیرا ہے تو ہمیں اندھیرے سے نجات پانے کے لئے اُجالے کی تلاش میں نکلنا پڑے گا۔ اور تب تک ہمیں اپنا سفر جاری رکھنا ہوگا جب تک کہ ہمیں صاف صاف دکھائی نہ دے۔ اور وہ منزل بھی آجائے کہ ہزاروں سال کے غموں کے پہاڑ ریزہ ریزہ ہوجائیں۔ اور ہمیں اُجالے میں اپنی منزل صاف صاف دکھائی دینے لگے۔ ہزاروں سال کی کلفتوں کے سمندر کی طغیانی کھیتوں کی سیرابی میں بدل جائے ایک انقلاب آجائے ہماری زندگیوں میں۔ اور ہماری اُمیدوں اور اُمنگوں کی فصل لہلہانے لگے۔ یہی ہماری سچی آزادی کی صبح ہوگی۔ فیضؔ اپنی نظم کے آخری بند میں شاعر کم فلسفی زیادہ محسوس ہونے لگے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد عظمت اللہ خان احساسؔ
ایس اے، ای آر پی، محکمہ تعلیمات
حیدرآباد، تلنگانہ سرکار

# قائد ملت ولسان امت نواب بہادر یار جنگ خلقؔ
## بحیثیت نثر نگار وشاعر

محمد بہادر خان نام اور خلقؔ تخلص تھا ، آپ نواب محمد نصیب خان نصیب بہادر جنگ مرحوم کے گھر ۱۳۲۲ھ میں پیدا ہوئے ۔

محمد بہادر نام تھا اور نواب بہادر یار جنگ ان کا خطاب تھا۔ تاریخ دکن میں ان کی بڑی قدر ومنزلت اور اہمیت ہے، وہ ایک مشہور خطیب وواعظ اور مسلمانوں کے ایک عظیم قائد تھے ۔ انہیں ''قائد ملت'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ کم عمری ہی سے ان کے اندر غیر معمولی صلاحیتیں قدرت نے ودیعت فرمائی تھیں ، چنانچہ اوائل عمری ہی سے ان کو شعر وشاعری سے غیر معمولی دلچسپی تھی اور متقدمین اساتذہ سخن کے ہزاروں اشعار انہیں ازبر تھے، اسی لئے ان کی طبیعت بھی موزوں ہوگئی تھی ۔ ان کے شعری ذوق کو مزید جلا ان کے اساتذہ مولانا سید اشرف شمسی اور وحید العصر مولوی سید نجم الدین صاحب المعمّی جیسے اہل علم وفضل سے ملی ۔

نواب بہادر یار جنگ کی ابتدائی تعلیم جامعہ نظامیہ حیدرآباد میں ہوئی مگر نواب صاحب کی زندگی کے اس پہلو یا مرحلہ سے کم لوگ ہی واقف ہیں مگر یہ حقیقیت ہے ۔ (باغ دلکشا، صفحہ ۴۸، صمصام شیرازی ۱۳۵۸ء)

اسی طرح مدرسہ عالیہ اور مدرسہ دارالعلوم میں بھی آپ نے عربی فارسی اور انگریزی کی تعلیم حاصل کی ، علاوہ ازیں آپ بہت سی سماجی سرگرمیوں سے وابستہ تھے، چنانچہ چار سال تک مجلس وضع قوانین میں طبقہ جاگیرداران کے نمائندہ بھی رہ چکے ہیں اور مجلس بلدیہ کی رکنیت کو بھی انجام دیا ہے اور آل انڈیا مہدویہ کانفرنس ومسلم یوتھ کانفرنس کی صدارت کے لئے بھی منتخب کئے گئے تھے، اسی طرح زیادہ تر مجلس اتحاد المسلمین کی سرگرمیوں سے بھی آپ کا تعلق رہا ہے، انہیں غیر معمولی خدمات کی بناپر آپ ہندو بیرون ہند کافی شہرت ومقبولیت رکھتے ہیں ، اسی لئے اس زمانے کے بڑے بڑے اہل فضل اور صاحب کمال ہر طبقہ کے لوگوں سے آپ کے مراسم تھے ۔ محمد وجاہت علی خان اپنے ایک مضمون ''قائد ملت نواب بہادر یار جنگؒ'' میں یوں لکھتے ہیں :

''علامہ اقبال سے قائد ملت کی پہلی مرتبہ ملاقات ۱۳ مارچ ۱۹۳۷ء کو دہلی میں ہوئی ۔ اس وقت آپ کے ساتھ خواجہ حسن نظامی بھی تھے ۔ علامہ اقبال نے آپ کی

تقاریر کے بارے میں سن رکھا تھا، وہ بہت متاثر بھی ہوئے اور رخصتی کے وقت قائدملت کا ہاتھ' ہاتھ میں لے کر فرمایا: وعدہ کرو کہ ملت کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کردوں گا''۔

قائداعظم محمد علی جناح سے آپ کی ملاقات پہلی بار ۱۹۲۸ء میں منعقدہ ایجوکیشنل کانفرنس میں ہوئی' قائد ملت نواب بہادر یار جنگ کو قائداعظم بہت چاہتے تھے اور یہی حال قائدملت کا بھی تھا، دہلی میں ایک مرتبہ قائداعظم نے قائدملت سے مالی مشکلات کا ذکر کیا اور جلسہ میں قائد ملت نے اس پر اثر انداز میں تقریر کی کہ سوا لاکھ روپئے سے زائد رقم جمع ہوئی، اس تقریر کو سن کر شرکاء جلسہ جو بھی ساتھ لائے تھے وہ آپ کی اپیل پر نذر کردیئے تھے، یہاں تک کہ خواتین نے اپنے زیورات تک اتار کر آپ کی نذر کردیئے تھے، اس کے علاوہ اس دور کے بڑے رہنما بابائے قوم گاندھی جی' بلبل ہند سروجنی نائیڈو' اور گرو رابندر ناتھ ٹیگو بھی قائدملت کی صلاحیتوں سے بہت متاثر تھے، بانی جماعت اسلامی جناب ابوالاعلیٰ مودودی بھی قائد ملت سے کافی متاثر تھے اور انہوں نے ایک مرتبہ قائدملت کو''رسالہ دینیات'' کا تحفہ بھی دیا تھا۔

نواب بہادر یار جنگ کے استاد علامہ سید اشرف شمسی کا شمار اہل کمال علماء میں ہوتا تھا، وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسر تھے، وہ عربی وفارسی علوم کے جامع تھے اور صاحب تصانیف کثیرہ تھے، چنانچہ ان کی کتابوں کی تعداد (۱۰۰) تک بتائی جاتی ہے، قرآن مجید کی مکمل تفسیر لوامع البیان' رسالۃ المعراج' تنویرالہدایہ' رسالہ دعا وغیرہ کئی کتابیں نہایت اہمیت کی حامل ہیں، ایسی علمی شخصیت سے نواب بہادر یار جنگ نے خوب استفادہ کیا، اسی طرح شیخ عمر بن سعید العمودی سے انہوں نے عربی سیکھی، نواب بہادر یار جنگ کو نواب بہادر یار جنگ بنانے میں ان کے معیاری ذوق مطالعہ کا بھی غیر معمولی کردار تھا جنہیں نادر ونایاب کتابوں پر مشتمل اپنے دادا کا کتب خانہ بھی ملا تھا۔ اس طرح انہوں نے مطالعہ میں انہماک پیدا کیا تھا جس کی وجہ سے ان کے ذہن میں وسعت اور معلومات وحافظہ میں اضافہ ہوا تھا جس کا اظہار ان کی تقاریر میں ہوتا تھا، اسی طرح نواب بہادر یار جنگ صغرسنی ہی سے مضمون نگاری کیا کرتے، چنانچہ ان کے مضامین اس زمانہ میں خواجہ حسن نظامی کے رسالے' منادی' اسی طرح طبقہ مہدویہ کے رسالہ المصدق وغیرہ میں شائع ہوتے تھے، ان کے مضامین سے متاثر ہوکر ملک کے نامور ادیب اور اسلامیات کے ماہر مولانا سید سلیمان ندوی نے فرمایا تھا کہ ان کی نثر شاعری کا نمونہ ہوتی تھی اور یہ رنگ آخری دور کی تحریروں تک اسی انداز میں اپنا رنگ جماتا رہا۔

**نمونہ نثر:**

''اس دن کرہ ارض میں شادیانے بجے ہوں گے اور سمع انسانی نے خوشیاں منائی ہوں گی جبکہ فرزند آدم کی زبان سے پہلی مرتبہ کلام موزوں نکلا ہوگا، تاریخ ساکت اور ہمارا قلم تہی دامن کہ اس کلام موزوں کا موضوع کیا ہوگا، وہ جذبات عشق ومحبت تھے، یا نفرت

وعداوت وہجو غیر تھی یا ستائش خویش' پستی کا احساس تھا یا عظمت وشان کا اظہار لیکن اگر شاعری کسی وجدانی کیفیت کا نام ہے تو ہم کم از کم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اس کلام موزوں کے اتباع کرنے والوں کو'' غاوٗن'' کا لقب ملا ہوگا' خدا نے ام الکتاب میں سب سے پہلے اپنی صفات الوہیت ورحمت کا ذکر کیا ہے۔ کیا تعجب ہے کہ اس اشرف المخلوقات نے رب الرحیم کے جذبہ ہائے حسن وجمال سے سب سے پہلے تاثر قبول کیا اور اس کی حمد وثناء میں زبان کھولی ہو وہی شعر جو داوٗد کی زبان سے نکل کر رشک صد ہزار عبادت ہوجاتا تھا، امراء القیس کے ناپاک جذبات کا حامل بن کر سمع حق شنو کے لئے بار ہونے لگا، شاعر فطرت وقدرت کا وہ شاگرد رشید جس کی عقل پردوں کو اٹھاتی، جس کی آنکھیں اسرار کو دیکھتی اور جس کی زبان حقیقتوں کو مجاز کی صورت میں ہمارے آگے پیش کردیتی ہے۔

کیا ہم نہیں جانتے کہ اس کی رزمیہ نظمیں خرمن امن کے لئے برق سوزاں ہوتی تھیں اور اس کے محبت سے بھرے ہوئے اشعار ٹوٹے ہوئے دلوں کے لئے آہنی زنجیر' کیا پست اور گری ہوئی قوموں کی رفعت وبلندی کے اسباب میں آپ شاعر کے قلم کو نہیں پاتے اور کیا غیرت وحمیت سے محروم ملل نے اس کے دل سے اٹھتی ہوئی آوازوں سے خداشناسی وخودداری نہیں حاصل کی''۔

**نمونہ شاعری:**

نواب بہادر یار جنگ کا کلام جو تذکروں اور ان کی سوانح حیات میں موجود ہے، اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے غزل' نظم' رباعی اور حمد ونعت میں طبع آزمائی کی ہے اور مذکورہ اصناف میں ان کا کلام ملتا ہے مگر مجموعی اعتبار سے ان کے کلام میں سلاست، روانی، آمد، بے ساختگی، شگفتگی اور خوش اسلوبی جیسے اوصاف ہیں اور کلام سے ان کی مکمل علمیت جھلکتی ہے اور اشعار کے ملاحظہ کرنے سے بآسانی سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ وہ پختہ گو اور کہنہ مشق شاعر تھے، جنہیں زبان وبیان پر مکمل دسترس حاصل تھی، متفرق اشعار ملاحظہ ہوں:۔

اے کہ ترے وجود پر خالقِ دو جہاں کو ناز
اے کہ ترا وجود تھا وجہِ وجودِ کائنات
تیرے عمل سے کھل گئیں تیرے بیاں سے حل ہوئیں
منطقیوں کی الجھنیں' فلسفیوں کی مشکلات
اے کہ تیری زبان سے ربِ قدیر گل فشان
نطق خدائے لم یزل تھی تیری ایک ایک بات
مجھ سے بیاں ہو کس طرح رفعتِ شان احمدی
تنگ مرے تصورات، پست مرے تخیلات

ooo

تری بے نیازی کا پر تو ہے مولا!
کہ سب کچھ لٹا کر بھی شرما رہا ہوں

ooo

یا تو سرتاجِ دوجہاں کردے
یا ہوس ہی نہ رکھ مرے دل میں

ooo

یہ تیر ستم کس کی چٹکی سے چھٹایا رب
یاں جو نظر آتا ہے بسمل نظر آتا ہے

حسرت ہی رہی دل کو طوفاں سے الجھنے کی
دو چار ہی غوطوں میں ساحل نظر آتا ہے

ooo

دنیائے سیاست کے کامل بھی ادھورے ہیں
ناقص بھی مدینے کا کامل نظر آتا ہے

ooo

اسی طرح ایک غزل کے چند شعر پیش ہیں جو سہل ممتنع کا نمونہ ہیں۔

کفِ قاتل میں خنجر دیکھتے ہیں
جدا ہم جسم سے سر دیکھتے ہیں
خیالِ آتش ِرخ بھی غضب ہے
کہ آنسو کو بھی اخگر دیکھتے ہیں
ستم ہے تیر مژگاں کا تصور
سرموکو بھی نشتر دیکھتے ہیں

ooo

چھوٹی بحر کے اشعار بھی سادگی وسلاست کا بہترین نمونہ ہیں، ملاحظہ ہوں:

یہ کہاں تھے نصیبِ عاشق زار
یار بالائے بام آتا ہے
مژدہ اے مے کشان مستِ الست
ساقی بادہ بجام آتا ہے
اہل محفل ہیں گوش برآواز
خلق شیریں کلام آتا ہے

ooo

نواب بہادر یار جنگ کی ایک نظم ہے جو حسب حال خود ہے، اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

دیدنی ہے رقص بسمل آ سربام آ کے دیکھ
امتحاں ہے آج تیرے عاشق جاں باز کا
ہے خدا کی دین تقریر وخطابت کا کمال
کیا اتارے گا کوئی چربہ میرے انداز کا
مردہ دل پاتے ہیں جانِ تازہ نغموں سے مرے
ایک پردہ ہوں حیاتِ سرمدی کے ساز کا
خون مسلم سے دکن کی سرزمیں ہے لالہ زار
ہرگل تر آئینہ دار اک شہید ناز کا
دیکھتا ہے کرمک شب تا رخورشیدی کے خواب
ہے کبوتر کو بھی دعوی ہمسری ٔباز کا
اور شاہان جہاں مست مئے پندار ہیں
ان پہ جادو چل گیا ہے حرص دنیا ساز کا
اے خدائے مصطفیٰ اے رب کعبہ کچھ تو بول
حشر کیا ہوگا تری اس آخری آواز کا

ooo

رباعیات ملاحظ ہوں:۔

آگاہ رموز دین فطرت ہوں میں
کچھ مجھ سے سنو لسان امت ہوں میں
میں خطبہ سرا نہیں تو سونی ہے بزم
شاہنشہہ اقلیمِ خطابت ہوں میں

ooo

دولت کو جہاں کی آنی جانی سمجھو
عزت کو خدا کی اک نشانی سمجھو
اِتراؤ نہ اپنی خوش بیانی پر خلقؔ
اس کو بھی خدا کی خوش بیانی سمجھو

ooo

ایک نغمہ ہے ریل کی روانی میں بھی
اک نغمہ ہے بہتے ہوئے پانی میں بھی
اک ساز ہے کائنات سچ پوچھو تو
کچھ لطف ہے جہان فانی میں بھی

ooo

ایک قطعہ جو نواب بہادر یار جنگ نے میسور میں بمقام چاہ منڈی میں رات کے دلکش منظر کا نظارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ ملاحظہ ہو:۔

اے آسمان دیکھا انسان کی طاقتوں کو
میسور کی زمیں پر تارے چمک رہے ہیں
بکھرے ہوئے یہ گل ہیں ٹیپو کے خوں کے قطرے
میسور کی زمیں پر تارے چمک رہے ہیں

غزل کے چند متفرق اشعار ملاحظہ ہوں جن سے مکمل طور پر نواب صاحب کی شاعرانہ صلاحیتوں کی غمازی ہو رہی ہے:

یار کی خاطر مجھے رسوائی بھی منظور ہے
اک ذرا وہ مسکرا تو دیں لب بام آ کے آج
یخ بستہ ہوگئے ہیں حریفان تنگ دل
دیکھیں جو مجھ سے آپ کی یہ گرم جوشیاں
ٹالنا چاہتے تھے وہ مجھ کو
میں نے سر آستاں پہ ٹیک دیا
یار کی دل نوازیوں کو دیکھ
بھول جا بے قراریاں اے دل
یار کی تصویر کھینچی جائے گی
یعنی ممکن ہوگا اب امر محال

ooo

مذکورہ بالا اشعار کے ملاحظہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نواب بہادر یار جنگ اپنی قائدانہ' خطیبانہ'واعظانہ وناصحانہ صفات سے قطع نظر غزل گوئی میں بھی اپنا اعلی مقام رکھتے تھے اور معاملات حسن وعشق کو نہایت سلیقے سے اپنے اشعار میں باندھتے تھے۔ بلاشبہ نواب بہادر یار جنگ غزل کے ایک کہنہ مشق اور نغز گو شاعر تھے، مگر یہ عجیب بات ہے کہ آج دنیا انہیں صرف ایک مشہور ومقبول خطیب' مقرر اور واعظ ہی کی حیثیت سے جانتی ہے مگر ادبی دیانتداری کا تقاضا ہے کہ ان کے شاعرانہ پہلو کا بھی بھرپور ذکر ہو۔ غرض یہ پیکر علم عمل اور آفتاب علم وادب ۲۵ جون ۱۹۴۴ میں اپنے ایک دوست جناب ہاشم علی خان کے ہاں ڈنر پر مدعو تھے' کھانے میں ابھی دیر تھی۔ وقت گذاری کے لئے حقہ منگوایا گیا۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اور سکندر علی وجدؔ کے ساتھ اقبالؔ کے اس شعر پر:۔

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

اپنے تاثرات بیان فرماتے ہوئے حقہ کے پہلے ہی کش کے ساتھ ہچکی آئی اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

☆☆☆

ڈاکٹر شیخ عبدالغنی
سنسکرت اسکالر

1-3-257/1
پہاڑی نگر، ضلع بھونگیر یادادری۔508116 (تلنگانہ)

# اُردو ادب پر ویدک تہذیب کا اثر

ادب سماج اور تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے۔ سنسکرت ادب ہندوستانی تہذیب وثقافت کا عکس ہے۔ زمانہ وید سے لے کر آج تک اس کا تسلسل جاری وساری ہے۔ اور اس کی روح، معاصر ادب میں دکھائی دے رہی ہے۔

اردو ادب کا فروغ شروع میں مسلمان فرمانرواوں کی سرپرستی صوفی اور درویشوں کی مجالس میں ہوا۔ اس ادب کا متن اسلامی تاریخ اور فارسی ادب سے لیا گیا ہے۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے آخر تک اردو فارسی کی جانشین بن گئی۔ عام لوگوں میں اردو کی مقبولیت بڑھتی گئی' موثر اظہار خیال کے لیے اردو کا استعمال ہونے لگا۔ نتیجتاً سبھی اصناف کی ترقی وترویج اردو میں ہونے لگی۔ یہاں اس حقیقت کو نہیں بھلایا جاسکتا ہے کہ اردو زبان وادب کا ارتقاء ہندوستانی ماحول میں یعنی گنگا جمنا کے گودی میں ہندوستانیوں کے ذریعے عمل میں آیا۔ لہٰذا ہندوستانی تہذیب وثقافت، ادب طرز زندگی وخیالات کے اثر سے اردو کا بری ہونا ناممکن ہے۔

اردو کی ابتدائی تخلیقات کا موضوع یا جز و سنسکرت ادب سے ماخوذ ہے جیسے بیتال پچیسی میں سنسکرت عہد کی تہذیب کا بیان ہے۔ سنگھاسن بتیسی، قصہ مادھونل وکام کندلہ، شکنتلا، طوطا کہانی، کلیلہ ودمنہ سنسکرت سے ماخوذ ہے۔

مہرشی پتنجلی (400ء) نے یوگ شاستر مرتب کیا۔ یہ فلسفہ، ہندوستانی فلسفہ میں اہم مقام رکھتا ہے۔ اسکا مقصد یہ ہے کہ انسان کو اپنے نفس اور ذہن پر قابو پانے کی ترکیب بتائے۔ رفتہ رفتہ یوگ کے معتقدوں کے دو فرقے ہوگئے جس میں سے ایک راج یوگ کا پیرو تھا اور یوگ کو نجات حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ مانتا تھا۔

دوسرا ہٹھ یوگ کی زیادہ قدر کرتا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ انسان کی روحانی اور جسمانی قوت کو معجزے کی حد تک پہنچادے اور اس کے اختیار کو اتنا بڑھا دے کہ وہ اپنے اور دوسروں کے ساتھ جو چاہے کر سکے۔

یوگ کی قوت سے دوسروں کے جسد میں داخل ہونے کے واقعات متعدد دکنی مثنویوں میں ملتے ہیں۔

''جنت سنگار'' کے ایک قصے میں ایک دغاباز وزیر اپنے بادشاہ کے خالی جسد میں منتر کے زور سے روح منتقل کر کے خود بادشاہ بن بیٹھتا اور داد عیش دیتا ہے۔ اس عمل کو پرکایا پرویش Parakaya pravesh کہا جاتا ہے۔ دوسرے جسد میں روح کی منتقلی کا تصور ہندوستانی عقائد کا

آفریدہ ہے اور مراقبہ (یوگ) کی قوت کا حاصل ہے۔

نظامی کی ''مثنوی کدم راو پدم راؤ'' میں روح کے منتر کے زور پر ایک جسد سے دوسرے جسد میں منتقل ہونے کی داستان نظم کی گئی ہے۔ ابن نشاطی کی ''پھول بن'' میں بھی پرکایا پرویش پر مبنی قصہ پیش کیا گیا ہے اور یہی حال ملک خوشنودی کی ''جنت سنگار'' کا ہے۔ روح کو دوسرے جسم میں پہنچائے جانے کے تصور پر مبنی قصے قدیم دور میں بہت مقبول رہے ہیں اور ان سے مختلف دکنی شعرا نے استفادہ کیا ہے — ہندوستانی قصص کا یہ عنصر بھی جنت سنگار میں مقامی رنگ کا اضافہ کرتا ہے۔

اردو ادب میں پہلی بار اس تصور کا عکس ہمیں نظامی کی ''مثنوی کدم راو پدم راؤ'' میں نظر آتا ہے اس میں اکھر ناتھ جوگی کدم راو کو تبدیل قالب کا منتر سکھاتا ہے۔ جوگی کدم راو کے جسم میں اپنی روح داخل کر کے خود شہزادہ بن بیٹھتا ہے ''کدم راو پدم راؤ'' کے قصے کا ماخذ و کرم کی کتھا ہے۔

پڑھایا اکھرناتھ منتر سکال
کہیا دیکھ پرتیو پَر تن سنبھال
کدم راؤ منتر پڑھا رہس کر
گیا پار پرونس کیتا سنور
کہے فخر دیں ایک سا چا بچن
بھلے پرکھئے جے کرے کوئی گن
کدم جیو جب لگ نہ لے گور آپ
اکھر جیو جوگی نہ اندر شتاپ
پراپت اکھر جیو لے گور راؤ
چھجے باج باہر دھرے ایک پاؤ

ہندوستانی افکار و تصورات کا اثر یوں تو اس زمانے کے ہر شاعر پر صاف طور پر نظر آتا ہے لیکن ان کا جتنا اور جیسا گہرا اثر ابراہیم عادل شاہ ثانی (۱۵۸۰ء تا ۱۶۲۷ء) کی نہ صرف شاعری پر بلکہ شخصیت پر بھی ملتا ہے۔ ویسا نہ تو اس سے پہلے کے شاعر پر ملتا ہے نہ اس کے بعد کے شاعر پر۔ وہ ہندوستانی موسیقی میں ایسی مہارت رکھتا تھا کہ ''جگت گرو'' کے نام سے مشہور ہوا۔ وہ سنسکرت زبان وادب کا سرپرست تھا۔ اس کی تصنیف ''کتاب نورس'' میں صرف اس کی شاعری ہی نہیں ملتی بلکہ موسیقی میں غیر معمولی مہارت کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ اس نے شیخ بہاؤالدین باجن اور محمود دریائی کی طرح اپنے گیت اور شعر راگ راگنیوں کے مطابق ترتیب دیے ہیں۔ ہر گیت سے پہلے راگ کا نام دیا ہے جیسے درمقام رام کلی نورس، درمقام اساوری نورس، درمقام دھنا سری نورس وغیرہ۔

جگت گرو کی شخصیت پر بھی ہندوستانی روایات اور اساطیر کا گہرا اثر ملتا ہے۔ وہ سرسوتی کو اپنی ماں کہتا ہے اور اس سے اپنی گہری محبت اور عقیدت کا اظہار کرتا ہے۔ اس بات سے بھی اس کو علم اور موسیقی سے جو والہانہ وابستگی تھی اس کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک جگہ وہ اپنا حلیہ لکھتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خالص ہندوی مزاج رکھتا تھا۔ وہ اپنا حلیہ یوں بیان کرتا ہے:

''ایک ہاتھ میں ساز ہے، دوسرے ہاتھ میں کتاب جس کو وہ دیکھتا ہے اور نورس کے گیت گاتا جاتا ہے، اس کا لباس زعفرانی ہے، دانت کالے اور ناخن پر مہندی لگی ہے، بڑا ہنرمند اور محبت کرنے والا ہے۔ اس کے گلے میں بلور کی مالا پڑی ہے۔ اس کا عزیز شہر بدیاپور (بیجاپور) اور محبوب سواری ہاتھی

ہے۔ابراہیم کے باپ علم کے دیوتا گنپتی اور ماں پاک سرسوتی ہیں۔'' (کتاب نورس گیت:۵۶)

کتاب نورس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ابراہیم عادل شاہ ثانی کو سنسکرت زبان وادب پر عبور حاصل تھا۔

جب کبھی کہیں دنیا میں اردو ادب کا ذکر ہوتا ہے تو ہماری زباں پر مرزا غالب کا نام آتا ہے۔کیوں کہ وہ اردو ادب کے معمار اور استادِ سخن تھے۔انھوں نے فارسی اور اردو میں کئی نمائندہ تخلیقات کی ہیں۔

غالب خاندانی پنشن کے تعین اور تقسیم کے معاملے میں اپنے ساتھ برتی گئی ناانصافی کے خلاف مقدمے کے سلسلے میں دہلی سے ماہ جنوری ۱۸۲۶ء میں روانہ ہوئے۔وہ سفر وحضر کی تمام صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے ۱۹/فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچے اور ۲۰/اگست ۱۹۲۹ء تک تقریبا ڈیڑھ سال تک مقدمے کے سلسلے میں کلکتہ ہی میں رہے اور پھر ناکام و بے مراد دہلی واپس لوٹ آئے۔زندگی کے تین چار سال سفر کلکتہ کی نذر ہوگئے لیکن گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا۔غالب کے لیے یہ سفر حاصل ثابت نہ ہوا لیکن ہندوستانی ادبیات کے لیے اس سفر کا سب سے بڑا حاصل ان کی مثنوی 'چراغ دیر' قرار دی جاتی ہے۔مرزا غالب نے یہ مثنوی دوران سفر اپنے قیام بنارس کے زمانے میں لکھی تھی 'چراغ دیر' ان کی تیسری فارسی مثنوی ہے۔

اردو غالب کی مادری زبان ہے اور فارسی پدری اور ان دونوں زبانوں پر انھیں مکمل عبور حاصل تھا۔

'چراغ دیر' سبک ہندی میں تخلیق کی گئی فارسی کی ایک شاہ کار مثنوی ہے۔ہندوستانی زبانوں میں اس کے ترجموں پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔سنسکرت زبان میں 'چراغ دیر' کے دو ترجمے ہو چکے ہیں۔ پہلا ترجمہ ڈاکٹر ناہید عابدی نے کیا جو راشٹریہ سنسکرت سنستھان، دہلی سے شائع ہوا تھا۔دوسرا ترجمہ پنڈت جگن ناتھ پاٹھک نے کیا ہے۔موصوف اس سے پہلے 'دیوان غالب' (اردو) کا سنسکرت میں منظوم ترجمہ کر چکے ہیں۔ یہ ترجمہ 'غالب کاویم' عنوان سے ۲۰۰۳ء میں الہ آباد سے شائع ہوا تھا۔

اردو زبان میں مثنوی چراغ دیر کے کئی ترجمے ہو چکے ہیں۔ان میں انصاری، اختر حسن، سردار جعفری، حنیف نقوی اور کالیداس گپتا رضا کے کیے ہوئے ہیں۔ ان میں سے دو ترجمے منظوم اور تین منثور ہیں۔

زمانہ قدیم سے بنارس سنسکرت زبان وادب ویدک مذہب کا مرکز رہا ہے۔شہزادہ داراشکوہ نے بنارس کے پنڈتوں کی مدد سے ۵۱ اپنشدوں کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا تھا جو ''سِرِّ اکبر'' کے نام سے مشہور ہے۔مرزا غالب نے اپنی مثنوی چراغ دیر میں بنارس شہر کی تعریف کے ساتھ ساتھ ان خیالات وافکار کا اظہار کیا ہے کہ جن کا تعلق ویدک تہذیب وفلسفہ سے ہے۔جیسے انسان جب تک مکتی نہیں پاتا اس کی روح پھر مادی جسم اختیار کرتی ہے لیکن جو بنارس میں مرتا ہے اس کی روح نجات کو پاتی ہے۔اور یہ شہر بت پرستوں کی راجدھانی ہے۔ کچھ نمونے ملاحظہ ہو۔

کہ ہر کس کاندراں گلشن بمیرد
دگر پیوندِ جسمانی نگیرد

-31 غالب

نکلتی ہے یہاں جب روح تن سے
تو پاتی ہے نجات آواگون سے

حنیف نقوی

(وہ کہتے ہیں) کہ اس گلشن (بنارس) میں جو شخص مرتا ہے وہ دوبارہ جسم سے پیوست نہیں ہوتا، یعنی پھر جنم نہیں لیتا۔

کالیداس گپتا رضا

چمن سرمایۂ امید گردد
بمردن زندۂ جاوید گردد

-32 غالب

بہار آتی ہے نخلِ آرزو پر
حیاتِ جاوداں ملتی ہے مرکر

حنیف نقوی

(آخرت سنوارنے کے لیے اس شہر کی زیارت) امید کا سرمایہ بن جاتی ہے۔ یہاں مرنے سے (انسان) امر ہوجاتا ہے (یعنی تینوں لوک سے مکتی پاجاتا ہے۔ 'چمن سرمایۂ امید' ترکیب ہے۔ غالب کے یہاں ایسی ترکیبیں ملتی ہیں)

کالیداس گپتا رضا

سوادش پائے تختِ بُت پرستاں
سراپایش زیارت گاہ مستاں

-46 غالب

حریمِ بت پرستاں ہے یہ خطہ
زیارت گاہ مستاں ہے یہ خطہ

یہ بستی مورتی کے پجاریوں یعنی ہندوؤں کی راجدھانی ہے اور پورا کا پورا شہر مستوں کے لیے زیارت گاہ ہے۔ (کالیداس گپتا رضا)

عبادت خانۂ ناقوسیانست
ہمانا کعبۂ ہندوستانست

-47 غالب

عبادت خانۂ ناقوسیاں ہے
یہ گویا کعبۂ ہندوستاں ہے

یہ سنکھ پھونکنے والوں (یعنی ہندوؤں) کا عبادت خانہ ہے اور بالیقین ہندوستان کا کعبہ ہے۔ (کالیداس گپتا رضا)

رامائن اور مہابھارت ہندوستانی ادب کے مخزن علوم مانے جاتے ہیں۔ ان تخلیقات کے موضوع و متن کی عکاسی بھی اردو ادب میں ملتی ہے۔ علامہ اقبال نے رامائن کے اصل کردار رام کی زندگی کی خصوصیات کی تشریح کرتے ہوئے بانگ درا میں یہ نظم لکھی ہے۔

لبریز ہے شراب حقیقت سے جام ہند
سب فلسفی ہیں خط مغرب کے رام ہند
یہ ہندیوں کے فکر فلک رس کا ہے اثر
رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بام ہند
اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت
مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نام ہند
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستان کو ناز
اعجاز اس چراغ ہدایت کا ہے یہی
روشن تر از سحر ہے زمانے میں شام ہند
تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں جوش محبت میں فرد تھا

اس کے علاوہ ان کی نظم نیا شیوالہ اور سوامی رام تیرتھ بھی اسی کڑی کی تخلیقات ہیں۔ جدید اردو شعراء نے اپنی غزلوں میں سنسکرت ادب کے کرداروں اور تلمیحات کا حوالہ بھی دیا ہے۔ جیسے:

کون اب گیاں چرائے بجائے بنسی ندی گھاٹ
دفتر میں ہے **کرشن**، جھکی ہے چولہے پر **رادھیکا**
(ناصر شہزاد)

کوئی منزل ہو مگر ساتھ رہی
زندگی ہے کہ ستی ساوتری
(فضیل جعفری)

جب سے ہوا ہے راج **پشاچوں** کا شہر میں
جنگل میں ہم کو خوف نہیں اپنی جان کا
(صادق)

مجھے بھی اپنی شکستوں کا کچھ صلہ مل جائے
ہرن کی کھوج میں نکلوں **شکنتلا** مل جائے
(نجیب رامش)

لالا شنکر دیال نشتر نے اردو میں شکتی چالیسی نام سے قصیدہ لکھا ہے جو اتنا ہی جذباتی اور وجدانی ہے جتنا سنسکرت اور دیگر زبانوں میں ہوتا ہے ملاحظہ ہو:

نمسکار اس کو ہی جس سے پیدا خلق میں ہر شئے
سپتے قتلے ستمگراں جو پئے درپئے رہے درپئے
مچا جب گل کی اے درگا یہ ہنگامے ترہم ہے
مدد کی برمالا سب دیوتا کہنے لگے جئے جئے
نمستسیہ نمستسیہ نمستسیہ نمستسیہ

ooo

مرزا غالبؔ نے مثنوی 'چراغ دیر' میں بنارس کی دل کشی کا اعتراف کیا ہے۔ نذیر بنارسی، اجتبیٰ رضوی بھی بنارس کی جلوہ سامانیوں اور حشر سامانیوں کے معترف رہے ہیں۔ حفیظؔ بنارسی نے '**صبح بنارس**' میں منظر نگاری نہیں جزئیات نگاری کی ہے۔ مترنم الفاظ، نادر تشبیہات اور منفرد استعاروں نے اس نظم کو ایک عجیب سحر انگیزی عطا کی ہے۔ انھوں نے ایک مصور کی طرح نقش نہیں ابھارے ہیں بلکہ ایک عکاس کی طرح مختلف مناظر کی عکاسی کی ہے۔ اس نظم میں مختلف مناظر مراحل میں نظر بردوش ہوتے ہیں۔ اس کے مختلف اجزاء الفاظ کا جامہ پہن کر قاری کے ذہن پر منعکس ہوتے ہیں جس میں ایک لطیف تسلسل کا احساس ہوتا ہے اور اختتام پر تکمیل کا احساس اجاگر ہوتا ہے۔ عقیدت شاعر کو کثافت پہ نظر ڈالنے کا موقع فراہم نہیں کرتی ہے اور پوری نظم درجہ بدرجہ قاری کے ذہن پر مثبت ہوجاتی ہے۔ درج ذیل اشعار شاعر کے حساس دل کے ترجمان ہیں:

یہ مستی کی دنیا یہ مستی کا عالم
اندھیرے اجالے کا ملنا یہ باہم
یہ شام وسحر کا فسوں خیز سنگم
عجیب مناظر دل نشیں دیکھتا ہوں
بنارس کی صبح حسیں دیکھتا ہوں
ادھر **سنکھ** پھونکا گیا **مندروں** میں
اذاں ہوری ہے ادھر مسجدوں میں
خدا ہی خدا ہے بشر کے دلوں میں

کمال عبادت یہیں دیکھتا ہوں
بنارس کی صبح حسیں دیکھتا ہوں
نہاکر کوئی **لاجونتی** کھڑی ہے
لیے دستِ نازک میں **گنگا جلی** ہے
کوئی حور ہے یا کوئی جل پری ہے
یہ کیا جلوۂ نازنین دیکھتا ہوں
اگر موت آئے یہیں موت آئے
کہ جینے کا سامان یہیں دیکھتا ہوں
بنارس کی صبح حسیں دیکھتا ہوں

ooo

اس طرح اردو ادب پر ویدک تہذیب کا کافی گہرا اثر دکھائی دیتا ہے۔ یہ ایک وسیع موضوع ہے جس کا احاطہ ایک مقالہ میں کرنا دشوار ہے۔ اس موضوع پر کئی جلدیں شائع کی جاسکتی ہیں۔مختلف ادوار میں مختلف اصناف میں سنسکرت ادب اور ویدک تہذیب کا اردو ادب پر کیا اثر ہے؟ یہ ایک دلچسپ موضوع ہے جس کی طرف تحقیق نگاروں کو توجہ دینی چاہیے۔ اس موضوع کی طرف صرف اشارہ کرنا میرا مقصد ہے۔

**کتابیات:**


1۔کلیات اقبال۔ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ2003

2۔تاریخ سنسکرت ادب، ڈاکٹرشیخ عبدالغنی، سدبھاونا پبلیکیشن، بھونگیر،2009

3۔معصوم عزیز کاظمی''حفیظ بنارسی: شاعرِ شہردل'' ماہنامہ آج کل،نئی دہلی جولائی2013

4۔کچھ ہندومت کے بارے میں، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ 1993

5۔جنت سنگار،مرتبہ پروفیسرسیدہ جعفر،قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان نئی دہلی۔1997

6۔مثنوی کدم راو پدم راو، مرتبہ ڈاکٹرجمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔1979

7۔کتاب نورس،مرتبہ نذیراحمد،لکھنو یونیورسٹی،لکھنو۔1955

8۔مثنوی 'چراغ دیر' مرتب پروفیسر صادق، اردو اکادمی دہلی۔2015

9۔آج کل ماہنامہ،نئی دہلی۔اپریل۔2007

10۔ پروفیسر یوسف سرمست،''قدیم دکنی شاعری پر ہندوستانی افکار کا اثر'' ہندوستانی اساطیر اور فکر وفلسفہ کا اثر اردو زبان وادب پر، مرتب پروفیسر قمر رئیس اردو اکادمی، دہلی۔2009

11۔پتنجلی کا فلسفہ یوگ، ہری کرشن داس گوئندکا،مترجم کرشن کمار پاٹھک،ترقی اردو بیورونئی دہلی1989

12.Sanskrit and other Indian Langaueges, shashi prabha kumar special center of sanskrit studeis JNU& DK print world (p) Ltd. New Delhi-2007


☆☆☆

**اُردو پڑھیے اُردو سیکھیے سیکھایئے اوراس زبان کی حفاظت کیجئے۔اپنے نونہالوں کو یہ زبان پڑھایئے۔**

ڈاکٹر آفتاب عرشی
اسکالر اُردو

C/27 'ون رو ہاؤز' این آر ا لا بین آفس'
عقب گڈ لک بیرل مارکٹ' ڈانیلمڈا' احمد آباد۔380028 گجرات۔

# اُردو کے فنی جہات

اردو ادب کا سب سے پہلا ادبی کارنامہ شاعری ہی انجام پایا ہے ۔ یعنی کہ اردو ادب کی ادبی شناخت نظم نگاری (شاعری) سے ہوئی ہے۔اردو زبان میں نظم ہو یا غزل دونوں کی ابتداء دکنی دور میں ہوئی ہے۔ بلکہ یہ بھی ایک حقیقت ہی ہے کہ دکنی دور میں پہلے نظم وجود میں آئی اور پھر بعد میں غزل۔

بہرحال اردو میں نظم نگاری کے میدان میں جو انقلاب رونما ہوا جس کی گونج آج تک اردو شاعری میں سنائی دیتی ہے وہ عہد حاؔلی اور ان کے رفقائے کار کا عہد تسلیم کیا جاتا ہے۔اس عہد میں اردو شاعری میں (نظم نگاری) بہت سی چھوٹی بڑی تبدیلیاں فکری اور ذہنی طور پر ابھرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ان تبدیلیوں میں ایک اہم تبدیلی تو یہ تھی کہ زیادہ تر اردو شعراء اپنا دامن غزل سے بچا کر نظم کو مرکزی حیثیت کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہہ دیا جائے تو شاید غلط نہ ہو کہ ہر چھوٹا بڑا شاعر اپنے آپ کو نظم نگاری کی طرف مائل کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ کامیاب ہوئے تو کچھ ناکام بھی اور اسی تبدیلی کے ساتھ جدید نظم نگاری کی ابتداء کو قبول بھی کیا جاتا ہے۔اس کے کئی وجوہات ہو سکتے ہیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ ہر عہد کے معاشرے کے اپنے لوازمات ہوا کرتے ہیں جس کا عکس اس عہد کی شاعری میں صاف طور پر نظر آتا ہے یعنی کہ ہر دور کی شاعری کے موضوعات ہوا کرتے ہیں ۔ جیسے کہ دکنی دور کی نظم نگاری کو موضوع کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اس عہد میں زیادہ سے زیادہ مذہبیت کے جذبات کو فروغ دیا گیا ہے۔ وہیں میرؔ اور سوؔدا کے عہد پر نظر ڈالیں تو معاشرے میں پھیلی ہوئی بے یقینی کے ساتھ ساتھ اقدار کی ٹوٹتی ہوئی دیوار کا دائرہ وسیع ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ جس کی وجہ سے اُس عہد کی شاعری میں کساد بازاری، طوائف الملو کی انتشار اور شکست کی گونج جا بجا سنائی دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے اُس عہد کی شاعری میں ہجو، شہر آشوب کو پروان چڑھتا ہوا دیکھا جا سکتا ہے۔ یعنی کہ یہ بات تو صاف ہے کہ ہر عہد کے اپنے عہد کے مرکزی موضوعات ہوا کرتے ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ ہر دور کی نظم نگاری نے خود کو زیادہ تر خارجی زندگی پر بکھرے ہوئے احساسات کی عکاسی کی ہے اور اپنے شعور کی آواز کو بلند کیا ہے۔

حاؔلی اور ان کے رفقا کے زمانے میں اردو نظم نے پھر کروٹ لی۔ میرؔ اور سوؔدا سے لے کر غالبؔ کے عہد تک کی شاعری میں شکست اور زوال کے احساسات چیخ چیخ کر

اپنے کھوکھلے معاشرے کی طرف اشارہ کرتے ہیں ۔جس سے معاشرے میں خودغرضی، بے راہروی اورقدروں کی شکست وغیرہ تمام ایسے موضوع شاعری میں رونما ہوئے ، جوانسانی پیشانی پرایک بدنما داغ کی طرح روشن ہے ۔اس سلسلے کی آخری کڑی غدرکوتسلیم کریں تو زیادہ بہتر ہوگا۔

حالؔی کے عہد میں اردونظم کے مزاج میں وہی قدیم رنگ کی چھلکیاں ہیں۔ وہیں خارجی زندگی کی عکاسی اورسنگھاسن سے معاشرے کو دیکھنے کا زاویہ نظر آتا ہے ۔ ہاں اگران میں تبدیلی رونما ہوئی تو وہ اقبالؔ کی نظم نگاری سے،شایداسی بناپرناقدوں نے جدیدنظم نگاری کے باقاعدہ آغاز کے حوالے سے اقبال کوسرِفہرست ٹھہراتے ہیں۔ اقبالؔ کے یہاں فطرت کے تینوں بڑے عناصر یعنی کہ گہرائی، وسعت،اورحسن کا بھرپوراحساس ملتا ہے۔ان کی شاعری کے ابتدائی دور میں ہی حسن فطرت کے نقوش مل جاتے ہیں۔اس حوالے سےان کی پہلی ہی نظم''ہمالہ'' کوہی لےلیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقبالؔ کے یہاں فطرت کو گہری نظر سے دیکھنے کے نقوش ملتے ہیں۔ بلکہ اس بات کا بھی احساس اقبالؔ نے دلایا ہے کہ فطرت کی خوبصورتی سے وہ کس حدتک متاثر ہیں۔مگر پھربھی حالؔی کی اہمیت کونظرانداز بالکل نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ حالؔی نے غزل کے بجائے نظم کو مرکزی حیثیت کی تحریک کا آغاز کیا ہے۔انہوں نے غزل کے بجائے نظم کومرکزیت دی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ان میں سب سے اہم وجہ حالؔی نے نظم سے اصلاح کا کام لینا چاہا تھا۔ کیوں کہ غزل کے مزاج میں وہ بات نہیں جونظم کےتسلسل میں ہے ۔غزل اشاروں کی زبان میں بات کرتی ہےاورنظم اپنے مقصد کی وضاحت کرتی ہے ۔ ویسے بھی اس وقت حسن وعشق کی واردات کا نام تھا۔

اس سلسلے میں وزیرآغا لکھتے ہیں کہ:

''اس زمانے کی غزل جسم اوراس کے لوازم کی عکاسی کر رہی تھی اورنظم کی تحریک غزل کے اس رجحان سے نجات پانے کی ایک کوشش تھی''

اردوشاعری کامزاج(ص۳۹۸)

اس کے علاوہ اوربھی چند اہم نکات ایسے ہیں جونظم کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

حالؔی کوشاعری سےقوم کی اصلاح کا کام لینا تھا۔ جب کہ غزل اپنے محدودکینوس کی وجہ سے اس اصلاح کا پوری طرح ساتھ نہیں دےسکتی تھی۔اورغزل کے مقابلے میں نظم کاتسلسل موضوع کوکڑیوں کے ساتھ بآسانی احاطہ کرسکتا ہے۔

حالؔی کا عہد پوری طرح سماجی، سیاسی تحریک کی ابتدا کا وہ دورتھا جس میں انسانیت کے لٹتے ہوئے اقدار پامال ہوتے ہوئے نظرآرہے تھے۔جس کی وجہ سےتحریک کے ساتھ ساتھ حالؔی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔اسی تحریک کے ہی زیراثر حب الوطنی کوفروغ ملتا ہوا نظرآتا ہے ۔ شاعری کووطن کی زمین سے جوڑا گیااوران کے مظاہر سے قریب کردیا گیا۔اس سے پہلے خاص طور پرغزل میں فارسی

ترکیب کے ساتھ ساتھ تشبیہات، استعارے اردو شاعری پر حکومت کر رہے تھے۔ مگر انھیں خاص طور پر اپنی زمین سے جوڑنے کی کوشش کی گئی۔ اس عہد کے قابلِ ذکر نظم گو شعراء حالؔی کے علاوہ محمد حسین آزادؔ، اسماعیلؔ میرٹھی، شبلیؔ، اور اکبرؔ الہ آبادی کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ جس میں دو گروہ ہیں۔ ایک طرف حالؔی، آزادؔ اور اسماعیلؔ تو دوسری طرف شبلیؔ اور اکبرؔ ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ دونوں گروہ کا مقصد ایک ہوتے ہوئے بھی دونوں کے مکتبہ فکر الگ الگ ہیں۔ یعنی کہ دونوں گروہ کا مقصد قوم کی اصلاح تھی۔ فرق ان میں تھا تو وہ یہ کہ حالؔی کے گروہ تلقین، وعظ اور نصیحت سے قوم کو راہِ راست پر لانا چاہتے تھے جب کہ اکبرؔ اور شبلیؔ نے زیادہ تر طنز کے تیر کو بکھیر کر اصلاح کرنی چاہی۔

حالؔی اپنے نقطۂ نظر کی وجہ سے جگہ جگہ اسلاف کے کارناموں کو پیش کرنے کی کوشش کی اور ساتھ میں زمانے کی ترقی پذیر رجحانات کی وکالت بھی کی۔ وہیں اکبرؔ کا یہ خیال تھا کہ ترقی پذیر رجحانات قوم کو زوال کی طرف جانے کا سامان ثابت ہوگا۔ حالؔی کے نظریۂ کی وکالت میں ان کی نظم ''مسدسِ حالؔی'' (جس پر ''سرسید احمد خاں'' کو فخر تھا) کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اس نظم کے پہلے ہی چند بند لیجئے، جس میں حالؔی اپنی قوم کی زبوں حالی کا مقابلہ اسلاف کی برتری سے کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ضخامت کی وجہ سے نظم کا بند نہیں پیش کر سکتا۔ اور ایسا بھی نہیں کہ حالؔی نے صرف اسی نظم تک اسلاف کے دائرے کو محدود کیا، اور بھی بہت سی نظمیں ہیں جو یہ احساس دلانے پر مجبور کر رہی ہیں کہ حالؔی منبر پر کھڑے ہو کر قوم کو بیدار کرنے میں لگے ہیں۔ اس سلسلے میں محمد حسین آزادؔ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آزادؔ کی یہ خوبی تھی انہوں نے سامنے کے بکھرے ہوئے موضوعات پر نہیں بلکہ اوصاف اور قدروں پر قلم اُٹھایا ہے۔ مثال کے طور پر ان کی نظمیں امید، انصاف، قناعت، امن، حب الوطن، معرفت وغیرہ کے عنوانات سے ہی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آزادؔ اپنے نظریۂ سے کہیں زیادہ اپنے تخیل کی پرواز کی تقویت کو بہتر طور پر پہچانتے تھے۔ ایک اور اہم نام جو حالؔی کی اصلاحی تحریک سے وابستہ ہے اسماعیلؔ میرٹھی کا ہے۔ انہوں نے بھی حالؔی کی اصلاحی تحریک کے تحت نظمیں لکھی ہیں۔ مگر اسماعیل میرٹھی کو شاید اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ بڑوں کی اصلاح کرنے کے بجائے ہمیں بچوں کی اصلاح کرنی چاہئے تو شاید زیادہ مناسب ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے زیادہ تر بچوں کے لئے سیدھی سادھی آسان زبان میں سبق آموز نظمیں لکھ کر ہی ادب میں اپنا مقام بنالیا۔

اس کے علاوہ اسماعیلؔ نے غالباً اردو نظم میں پہلی بار نظم کی ہیئت میں بے قافیہ نظم لکھنے کا تجربہ بھی کیا اور شاید اسی تجربے کی بنا پر اسے تاریخی اہمیت دے کر اسماعیل میرٹھی کو جدید نظم کا بانی قرار دینا ناقدوں نے مناسب سمجھا۔ حالاں کہ شاعری میں ہیئت کے تجربوں کے حوالے سے عبدالحلیم شررؔ اور سر عبدالقادر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

یہ بات تو واضح ہوتی ہوئی نظر آتی ہے کہ حالؔی اور اکبرؔ کے معاصرین نے نظم نگاری کے میدان کو ہموار کر کے

جدید نظم کی راہیں ہموار کی تھیں ۔ ویسے تو جدید نظم کی ابتدا اقبالؔ سے ہوتی ہے۔ جس کے چند نکات پہلے ہی بیان کی زد میں آ گئے ہیں۔ اور چند نکات کی وضاحت کرتا چلوں: اقبالؔ نے خارجی زندگی کے علاوہ داخلی زندگی کی بھی عکاسی کی ہے۔ اور فرد کی انفرادیت کا پورا خیال بھی رکھا ہے۔ یہی رجحان اقبالؔ کو جدید نظم نگاری کا علم بردار ثابت کرتا ہے۔ اقبالؔ نے فرد اور معاشرہ، انسان اور کائنات کے رشتے پر گہری نظر ڈالتے ہوئے نظم نگاری کے ترقی کی راہ کو ہموار کیا ہے۔ ویسے بھی اردو نظم نگاری کی راہ پر اقبالؔ کی اہمیت ایک ایسے موڑ کی ہے جہاں ایک طرف کلاسیکی دور تو دوسری طرف رومانی دور کا سنگم نظر آتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں اقبالؔ کے یہاں بھی موجود ہیں۔ نظم نگاری میں باہر کے مناظر کو دل و روح کی دنیا سے جوڑنے کی جہت یقیناً اقبالؔ سے ہی ہوتی ہے۔ اب اس بنا پر اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو کہ اقبالؔ ہی سے رومانی تحریک کا آغاز ہوا۔ جس سے آگے چل کر جدید اردو نظم میں داخلیت کے قیمتی عناصر کا اضافہ ہوا۔

اردو کی رومانی تحریک کے سلسلے میں تین واضح صورتوں کا ذکر ''وزیر آغا'' نے اپنی کتاب ''اردو شاعری کا مزاج (اردو نظم ص ۴۱۵) میں کیا ہے اور رومانیت کے ادوار طے کرتے ہوئے شعرا کی بھی تقسیم کی ہے۔ جو اس طرح سے ہے:

(۱) رومانی (۲) نیم رومانی (۳) داخلی

رومانی تحریک کے علم برداروں میں اختر شیرانی اور عظمت اللہ کے نام اہم ہیں۔

نیم رومانی تحریک اقبالؔ سے متاثر نظر آتی ہیں اور یہ کاروان جوشؔ اور حفیظؔ کے علاوہ ترقی پسند تحریک کے بیشتر شعرا تک پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔

اب اگر خالص رومانی تحریک پر بات کی جائے تو یہ تحریک حالیؔ اور اقبالؔ تک کے دور میں کلاسکی انداز کی پاسداری کرتی ہوئی ذات کے بجائے کائنات کو اپنے اندر سمائے ہوئے نمودار ہوئی ہے۔

اس میں ہندوستان کی اس تاریخ کا بھی بڑا دخل ہے جس میں ہر طرف انتشار کا دَور دَورا ہونے کے سبب سیاسی و سماجی سطح پر بلکہ ذہنی اور نفسیاسی سطح پر بھی ایک ہیجان کی صورت پیدا ہوگئی تھی۔ پھر ادھر ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہوا۔ جس کا اثر صاف طور پر نظر آیا ہے۔ اب نفسیاتی وجوہات کچھ اور سہی مگر اس تحریک کے نمود کا جواز کچھ بھی تو انا تھا۔ حالیؔ اور اقبالؔ کے دور تک کی اردو نظم نے عورت سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اکبرؔ نے عورت کے پردے کے باہر آنے سے مرد کی آبرو لٹنے کا سبب بتایا ہے۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کی سماجی سطح پر متحرک ہونے کے لیے عورت کو ممنوعہ قرار دینا اس لیے بھی ضروری سمجھا گیا کہ معاشرے کی اصلاح کے بجائے کہیں شعراء عورت کے حسن میں گرفتار ہو کر نہ رہ جائیں اور مقصدیت کو فوق کر دیں، شاید اس لیے سماج کی بہبود کے پیشِ نظر عورت کے موضوع کو جہاں تک ہو سکا اس دور میں اردو نظم سے خارج کیا گیا ہے۔ بیشتر دانشور و شعرا نے عشق اور عاشقی کو اپنے قومی زوال اور شکست کی وجہ تسلیم کیا تھا اور اب شاعری کو قوم کی

ترقی کے لئے صرف کرنا ان کی فکر کے مقصد میں تھا۔ اس سلسلے میں اقبالؔ سے ہمیں تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ اقبالؔ اپنے بھلے ہی زمانے کے رائج تصورات کا احترام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مگر عورت اور اس کے محبت کے جذبے کو تو نہ سہی مگر عقل کے مقابلے میں دل اور عشق کو سماج کے مقابلے میں فرد کو اہمیت دے کر جو راہ نکالی ہے وہ راہ عورت کی ہی طرف جاتی ہے۔ اقبال کی نظمیں ان کے پہلے مجموعہ کلام ''بانگِ درا (حصہ اول)'' میں عورت، عورت کی تعلیم، عورت کی حفاظت جیسی نظمیں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ اقبال عورت کو پستی سے نکال کر بلندی عطا کرنا چاہتے تھے۔ اردو نظم میں عورت کے کھوئے ہوئے مقام کو واپس دلانے کا کام رومانی تحریک نے کیا ہے۔ جس کے علم بردار اختر شیرانیؔ اور عظمت اللہؔ تھے۔ مگر آغاز وابتداء اقبال نے ہی کی ہے۔

رومانی تحریک کے بعد نیم رومانی تحریک وجود میں آتی ہے۔ جس میں رومانی تحریک کے اسلوب کے کچھ اوصاف بھی شامل ہیں۔ جس کی وجہ سے نظم نگاری میں سپاٹ پن مدھم پڑ گیا۔ مجموعی طور پر اس نیم رومانی تحریک جس میں حفیظؔ، جوشؔ اور ترقی پسند شعراء کے بیشتر نام لئے جاسکتے ہیں۔ نیم رومانی تحریک کے متعلق ''وزیر آغا'' لکھتے ہیں کہ:

''نیم رومانی تحریک حالیؔ اور اقبالؔ اور کسی حد تک انقلاب اور مارکسزم کے نظریات سے متاثر تھی''

اردو شاعری کا مزاج: ص ۴۲۶

نظم کی اس نیم رومانی تحریک پر اقبالؔ کے جو اثرات نظر آتے ہیں اس کے اسلوب اور لہجے کا اثر قومی تھا۔ مگر ان کے بعد آنے والے شعراء نے بڑی حد تک اس لہجے کی تقلید کی۔ حالیؔ کے زمانے میں سماج کو فرد پر فوقیت حاصل ہونے کی وجہ سے شعراء نے آسان، سیدھا سادھا اور غیر مبہم انداز اختیار کر لیا تھا۔ تاکہ شعر کی زبان میں بات بآسانی عوامی سطح پر سمجھی جاسکے۔

جوشؔ نے تو اپنے انقلاب سے سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ بے شک جس کا آغاز اقبال سے ہوتا ہے۔ اقبال نے فرد کو رومانی طور پر بیدار کرنے کی کوشش تھی جب کہ جوشؔ کے یہاں مادی نقطۂ نظر محیط ہے۔ اس سلسلے میں حفیظ جالندھری کے یہاں کوئی خاص نقطۂ نظر نہیں ابھر کر سامنے آتا ہے۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ عوامی سطح سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ عورتوں کی بے پردگی کے خلاف نظمیں یا حب الوطنی کے جذبے کے تحت، مذہبی جذباتی نظموں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسانی زندگی میں اسلاف کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔

دراصل اقبالؔ کے اثرات جوشؔ، حفیظ اور ان کے معاصرین تک محدود نہیں اور ایسا ہونا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ کیوں کہ اقبالؔ اردو شاعری کے آسمان پر بیک وقت چاند و سورج کی طرح روشن تھے۔ جن کی چمک ان کے معاصرین تک ہی نہیں بلکہ ان کے بعد آنے والے شعراء کے یہاں بھی ملتی ہے۔ یعنی کہ ترقی پسند شعراء

اگر چیکہ نظریاتی طور پر اقبالؔ سے متصادم تھے مگر اسلوب اور لہجے کے ان کے یہاں بھی اقبالؔ کے اثرات نظر آتے ہیں۔ آغاز میں ترقی پسند شعراء اور داخلیت شعراء میں کوئی خاص طور پر فرق بھی نہیں محسوس کیا جاسکتا ہے۔جس کے بنا پر ایک طویل عرصہ تک جدید نظم کو شعراء ترقی پسند کا داعی اور علم بردار قرار دیا جاتا ہے۔شاید اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس دور کی ترقی پسند شاعری کا مزاج نیم روحانی تھی۔

اقبالؔ نے خارجی دنیا کی طرف قاری کی توجہ مرکوز کرتے ہوئے کہیں کہیں دولت کی غیر مادی تقسیم کے خلاف بھی اپنی آواز بلند کی ہے۔اس حوالے سے'' کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو'' کا نعرہ دلیل کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

ترقی پسند نظم گو شعراء نے سماجی شعور کی یہ روایت پھر تو اقبالؔ سے ہی اخذ کی ہے اور بے ساختہ مارکسزم کا اضافہ کر کے اقبالؔ کے ہی دوسرے نظریات سے بغاوت کی ہے۔یعنی ترقی پسند شعرا کے سامنے ایک واضح منزل تھی اور معاشرے کو بدلنے کے لیے مارکسزم کے موقف کو اختیار کیا تھا۔

اقبالؔ اور ترقی پسند شعرا میں اختلاف تھا لیکن انسانی زندگی کے خارجی مسائل کو دیکھنے کا زاویہ ایک ہی جیسا معلوم ہوتا ہے۔ترقی پسند شعرا کے یہاں اقبالؔ کا اثر اس بات سے بھی ظاہر ہے کہ انہوں نے خارجی زندگی میں تبدیلی لانے کے لیے ایک مکمل حقیقت پسندانہ رویہ اختیار نہ کیا بلکہ رومان کے راستے پر چل کر آئے ہیں۔اور اپنے واضح نظریات کی بنا پر سیدھا سپاٹ راستہ آغاز میں نہیں اختیار کیا مگر بعد میں انھیں بے حد عزیز تھا۔جو خاص طور پر ہندوستان کے بٹوارے کے بعد کی ترقی پسند نظم میں آیا تھا۔ چنانچہ تمام اہم ترقی پسند شعراء کے یہاں رومان کے راستے سے حقیقت تک پہنچنے کا واضح رجحان دکھائی دیتا ہے۔اس بنا پر اگر ترقی پسند شعراء کو نیم رومانی تحریک قرار دیا جائے تو شاید کوئی حرج نہیں۔

رومان سے حقیقت کی طرف بڑھنے کا رجحان فیضؔ کے یہاں واضح نظر آتا ہے۔جس کی بنا پر انھیں اولیت کا درجہ حاصل ہے۔فیضؔ کے یہاں اس سلسلے میں دو پہلو نظر آتے ہیں۔ پہلا یہ کہ فیضؔ شعر کو خالص رومانی پیرائے میں ڈھالتے ہیں جس سے اختر شیرانی کے اثرات کے تحت نظم کو محدود دائرے میں بند کر دیا ہے۔مگر فیضؔ کا یہ کمال ہے کہ عرفانِ ذات کو عرفانِ کائنات کے دائرے پر پھیلا دیا ہے۔ اور اپنے ذاتی غم میں کائنات کے ملانے کا کام فیض نے کیا ہے۔

دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ فیض نے اندر کی دنیا کو ایک خاص مقصد کے تحت باہر کی دنیا میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ یہ طریقِ کار رومان سے حقیقت کی طرف آنے کا میلان فیضؔ تک ہی محدود نہ ہو کر بلکہ ایک مینیفسٹو کے طور پر ساری ترقی پسند نظم کے پیشِ نظر آتا ہے۔ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ ترقی پسند شعرا نے اپنی محبوبہ کو مارکسزم کے لیے وقف کر دیا تھا۔مگر یہ بھی ہے کہ ترقی پسند شعرا میں چند نام ایسے بھی ہیں بالخصوص فیضؔ اور ندیمؔ جنہیں اس بات کا

شدید احساس تھا کہ فن کو نقطۂ نظر پر نہیں قربان کیا جا سکتا ہے جس کی وجہ سے اپنی ذات کو خارجی دنیا سے منسلک کرنے کی بڑی حد تک کوشش بھی کی ہے۔ یہ الگ موضوع ہوگا کہ ان میں کامیاب ہوئے کہ نہیں لیکن فن کی آبرو کو رسوا ہونے سے ضرور بچالیا ہے۔

چند ترقی پسند شعراء ایسے بھی ہیں جنہوں نے صرف رومانی نظمیں بھی لکھیں ہیں۔ فیضؔ، احمد ندیمؔ قاسمی، مجازؔ، ساحر، جاں نثار اختر اور بھی دوسرے ترقی پسند شعرا کے یہاں خالص رومانی نظمیں بھی مل جاتی ہیں۔

ترقی پسند تحریک کے اہم مقصد میں ایک یہ بھی تھا کہ عوام کو مخاطب کر کے ان میں جوش کے ساتھ ساتھ ولولہ پیدا کرنا تا کہ انہیں ایک تشلی کیفیت میں مبتلا کیا جائے۔ اسی وجہ سے ترقی پسند شعرا کے یہاں بیشتر بلند آواز کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص آہنگ بھی ان کے یہاں ملتا ہے۔

اردو نظم میں داخلیت کے دائرے میں دو واضح لہروں کی صورت اختیار کی ہے ان میں تیسری لہر بڑی تیزی سے سطح پر آئی ہوئی نظر آتی ہے۔ جس میں ایک طرف میراجیؔ اور ان کے معاصرین یعنی ن۔م۔راشد اور تصدیق حسین خالدؔ وغیرہ کی نظموں پر مشتمل ہے۔ دوسری طرف مجید امجدؔ، قیوم نظرؔ، یوسف ظفرؔ، اخترؔ الایمان، مختارؔ صدیقی، ضیا جالندھری، محمد صفدرؔ، عارف عبدالمتینؔ، ظہورؔ نظر، منیر نیازیؔ، خلیلؔ الرحمٰن اعظمی، قاضی سلیمؔ، محمد علویؔ وغیرہ کی نظموں سے عبارت ہے۔

اردو نظم نگاری میں میراجیؔ کو داخلیت کا ایک اہم علم بردار تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن اس ضمن میں تصدیق خالدؔ اور ن۔م۔راشد کے کارنامے کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ میراجیؔ کی طرح ان دونوں شعرا نے بھی آزاد نظم اور معراء نظم کو بڑی اہمیت دی ہے۔ بلکہ بعض لوگوں کا تو یہ خیال رہا کہ جدید دور میں آزاد نظم کو رائج کرنے والا تصدیق حسین خالدؔ تھا۔ میراجیؔ اور راشدؔ اس کے بعد اس میدان میں آئے۔ بہرحال ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ داخلیت کے رجحان کو کس نے کس حد تک اپنی شاعری میں مرکزیت کی حیثیت دی ہے۔ خالدؔ اور راشدؔ دونوں کے یہاں فرد کی بے چینی کا احساس ہوتا ہے۔ جو انفرادیت کی نمودار کی وجہ سے ہو سکتی ہیں۔ خالدؔ کی نظمیں زیادہ تر ''کتبہ اور حسنِ قبول'' ہے۔ پیڑ کو علامتی رنگ دے کر فرد کی بے چینی اور ناآسودگی ہی پیش کرتی ہیں۔ مگر وہیں راشدؔ کے یہاں بے اطمنانی اور بے چینی ان دونوں سے کہیں زیادہ ہے۔ جو خارجی اور داخلی سطح پر موجود ہے۔ مگر اردو نظم کو نقطۂ نظر سے آزاد کرانے میں راشدؔ کے اقدام کو بطور خاص اہمیت حاصل ہے۔ راشدؔ نے فرد کو اپنی ذات کے اظہار کی طرف مائل کرنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ داخلیت پسندی کے رجحان کو تحریک دینے کا کام کیا ہے۔ بلکہ اس سے پہلے تصدیق حسین خالدؔ اور راشدؔ نے اظہار کے لئے زمین ہموار کر دی تھی۔ مگر میراجیؔ نے اظہار کی تکمیل کی بنا پر میراجیؔ کی نظم ترقی پسند نقطۂ نظر کی ضد بھی سمجھی جاتی ہے۔

میراجیؔ کے یہاں موضوع کے اعتبار سے جنسیت کے موضوع بہت نمایا ہے۔ میراجیؔ کو اپنی ذات

سے گہرا لگاؤ ہونے کی وجہ سے کسی رجحان کا لیبل ان پر چپکایا نہیں جا سکتا ہے۔ میراجی کا جنس اور اس کی علامت کو برتنا دراصل ایک نفسیاتی مرحلہ ہوسکتا ہے۔ مگر ان جنسی علامات میں روزن دوسری عورت، گود اور من کے بالک کا ''کھین کو چندر ماں'' مانگنا، یہ سب باتیں ماں کی آغوش کی طرف لوٹنے کے عمل سے کم نہیں۔

میراجی کے مطابق وزیر آغا لکھتے ہیں کہ:

''جدید اردو نظم میں فراز سے نشیب کی طرف لڑھکنے کا آغاز میراجی سے ہوتا ہے۔ لیکن میراجی نے اپنی مدافعتی قوتوں کی مدد سے تحفظِ ذات کی کوشش بھی کی ہے۔ جس کے پیچھے میں تصادم اور آویزش کے متعدد پہلو اس کی نظموں میں ابھرتے چلے آئے ہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ میراجی سے اردو نظم کی ایک نئی جہت کا آغاز ہوتا ہے''

اردو شاعری کا مزاج: ص ۴۵۴

میراجی کی نظموں کا کمال باہر سے اندر کی دنیا کو دیکھنے کا ہے اور نظم کی بنیادی جہت بھی اسی طریقِ کار کو اہمیت حاصل ہے۔ اب اس طریقِ کار کو اختیار کرنے سے ''باطن کی دنیا'' نظم میں زیادہ سے زیادہ اجاگر ہوئی ہوتی نظر آتی ہیں۔

جدید اردو نظم نگاری داخلیت پسند شعرا کی تخلیقات کے پچھلے کئی برسوں کے کارنامے پھیلے ہوئے ہیں قومی اور بین الاقومی سطح پر دونوں ہی اعتبار سے دیکھا جائے تو نظم کی اس خاص جہت کو ابھرنے میں مدد دی ہے۔ ان میں دوسری جنگ عظیم لڑی گئی۔ جنگ کے آخری سال میں امیریکہ نے ہیروشیما اور ناگاساگی پر بم گرائے گئے۔ جس کی وجہ سے احساس ذہن جھجھلا سا گیا تھا۔ اٹیم بم کا یہ حادثہ انسانیت کا ایک بڑا المیہ ثابت ہوا۔ پھر ادھر ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم نے صدیوں کے تہذیبی سرچشمے کو بکھیرتے ہوئے انسانیت کو پامال کر دیا۔ اب تقسیم کے بعد دونوں ملکوں میں خودغرضی، اقربانوازی، دھاندلی، زباں بندی کا ماحول پیدا ہوا۔ جس کی وجہ سے شخصی آزادی کے معنی ومفاہم بدلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یعنی کہ معاشرہ حیوانیت کے طرف بڑھتا ہوا نظر آنے لگا۔ تو ظاہر سی بات ہے ایسے حالات میں قدرتی طور پر احساس ذہین عام رجحانات سے انحراف کرتے ہوئے اپنی ہی ذات میں اتر کر نئی قدروں کی تلاش میں لگ گئے۔

میراجی کے بعد درجنوں ایسے شعرا مل جائیں گے جن کے یہاں باہر سے اندر کی طرف آنے کی نہج نمایاں تھی۔ مثلاً۔ یوسف ظفر، قیوم نظر، مجید امجد، اختر الایمان، ضیا جالندھری، جذبی، منیب الرحمٰن، انجم رومانی، محمد صفدر، وشعرا مترعادل، سید فیضی، منظر سلیم، سلام مچھلی شہری، تخت سنگھ، مخمور جالندھری۔ سردار انور، الطاف گوہر اور ان کے بعد بلراج کومل، عارف عبدالمتین، ظہور نظر، ابنِ انشاء، فارغ بخاری، جمیل ملک، قاضی سلیم، شہزاد احمد، منیر نیازی، خلیل الرحمٰن، احمد فراز، شاذ تمکنت، شاد امرتسری، اور ادھر چند برسوں سے جو شعراء ابھر کر آئے ہیں عرش صدیقی، شکیب جلالی، شہریار، ساقی فاروقی، نذیر ناجی، جیلانی کامران، شہاب جعفری، ادیب سہیل، احمد شمیم، کرشن ادیب،

محمد علوی، صلاالدین ندیم، کمار پاشی، مخمور سعیدی، رحمان فراز، سلیم الرحمٰن، عمیق حنفی، بشر نواز، عزیز تمنائی، اور بھی درجنوں شعراء کے نام بآسانی لئے جاسکتے ہیں۔

جدید نظم نگاری کے اسی کاروان نے عورت کے بھی تمام پہلوؤں کو اپنے گرفت میں لے لیا ہے۔ اور دوسرے رخ پر خود کو تاریخ وتہذیب کے ماضی سے بھی جوڑ رکھا ہے۔ یعنی کہ جنگل کے معاشرے کی طرف شاعری کی مراجعت کو ظاہر کیا ہے۔ کہیں جنگل کی خوف ناک فضا کو محفوظ کیا، تو کہیں جنگل سے گزرتے وقت قدم قدم کے خوف سے لرزتا ہوا محسوس کیا۔ کبھی پاؤں میں سانپ کی پھنکار تو کبھی کانٹے دار شاخ میں اپنے ہی دامن کو الجھا پایا، یعنی کی انسانی تہذیب کا ماضی اسی جنگلی معاشرے میں خود کو تڑپا ہوا محسوس کر رہا ہے۔ اس جنگلی فضا سے نجات پانے کے لیے، اس کے تحفظ کے لئے ٹونے، ٹوٹکے، جادو کی مختلف رسوم سے مدد لینے کی طرف مائل ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرے میں ڈائنوں، بھوتوں اور بدروحوں نے جنم لیا۔ جس کی وجہ سے موت کے خوف میں شعرا مبتلا ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تاہم نظم کی اس جہت کو اختیار کیا اور موت کا یہ احساس بتدریج موت کے نسلی خوف میں بدلتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس طرح کی کیفیت اختر الایمان کے یہاں کچھ زیادہ ہی نمایا ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان کے غم میں ایک عجیب طرح کی کسک کا احساس ہوتا ہے۔ جو ان کی شکست سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دنیا کو ہی مٹا کے رکھ دے گا۔ غم کا گہرا احساس ان کے زندگی کے بعض حادثات کی پرچھائیوں کا دخل معلوم ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں اختر کی نظمیں محرومی، نقش پا، پگڈنڈی وغیرہ کے مطالعے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ضیا جالندھری کی نظموں میں بھی کیفیت نمایاں ہوتی ہے جو اختر کے یہاں موجود ہے۔ ان کی نظمیں زمہریر، زمستاں کی شام، سنبھالا، بجھی ہوئی آگ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

اردو نظم میں داخلیت کے اس سفر میں ایک اور باب کا اضافہ قابلِ غور ہے۔ علامتی نظمیں، چند شعراء نے تو صرف علامتوں کے استعمال پر سارا زور صرف کیا ہے۔ علامت سے مراد ہے کہ جب کسی شے کا ذکر کیا جائے تو یہ شے اس تصور کی طرف ذہن کو پوری طرح موڑ دے جو اس کا بنیادی وصف ہے۔ مثال کے طور پر پانی کے ذکر میں انسانی ذہن سیّال کی کیفیت کی طرف منتقل ہوجائے جو پانی کے ہر روپ میں ضروری طور پر موجود ہوتی ہے۔ یا چند آڑھی تیرچھی لکیروں کی مدد سے ایک ایسا خاکہ پیش ہو جس میں مکان کے تصور کو اخذ کرلیا جائے تو مکان کو ایک علامت قرار دیا جائے گا۔

جدید نظم میں علامت پسند شعرا کے ایک گروہ نے علامت کی تخلیق کے سلسلے میں اپنے آزاد خیال طریق کو اختیار کیا ہے۔ جو تخلیقی عمل رابطہ کی ضد ہے۔ اور جدید نظم گو شعرا یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔ کیوں کہ یہ ضروری نہیں کہ شاعر اپنی تخلیق قاری کے ہی لیے وجود میں لائے۔ وہ خود کی تسکین کے لیے بھی تخلیق کرسکتا ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے ایک شاعر، فن کار بیک وقت خالق بھی ہے اور قاری بھی۔ جہاں وہ ایک طرف تخلیق میں خود کو ایک نفسیاتی

کرب سے گزار کر اپنی تخلیق وجود میں لاتا ہے۔لیکن بعد میں اپنی تخلیق میں نئی سطح کو دریافت کرتا ہے ۔ اس وقت تو وہ قاری کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ بہرحال غزل کی علامت، اپنے تہذیبی رویے کی بنا پر وجود میں آتی ہے۔ بلکہ ایک خاص کیفیت یا صورت کی وضاحت کرتی ہے ۔ جو کسی اجتماعی رجحان یا تحریک کی مختصر شکل ہوتی ہے ۔ شاعر علامت کے ذریعے سے مختصر روپ میں پیش کرتا ہے۔لیکن نظم کی علامت میں زیادہ تر شاعر اپنے انکشافِ ذات کے لئے استعمال کرتا ہے۔کسی ایک عہد کے غزل گو شعرا کے یہاں علامتوں کی ایک خاص فہرست مرتب ہوجاتی ہے اور دوسرے دور کے غزل گو شعراء کے یہاں الگ الگ فہرست مرتب ہوجاتی ہے۔لیکن نظم کے جہت میں یہ بات شامل نہیں ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔نظم میں علامت کا تہہ دار گہرا اور بڑی حد تک مبہم ہونا ایک قدرتی بات معلوم ہوتی ہے۔انفرادی ہونا تو قابلِ فہم ہے۔نظم میں علامت کوئی مقصد کی بنا پر نہیں بلکہ تجربے کے بیان کی بنا پر اجاگر ہوکر محض ایک وسیلے کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔اصل چیز شاعر کے تجربے کی بنیاد ہے۔شاعر تخلیق کرنے پہ خود کو مجبور پاتا ہے ۔ اس بات کا سارا دارومدار شاعر کی اپنی ذات پر ہوتا ہے۔کہ وہ کس پہلو کو تخلیق میں اجاگر کرنا چاہتا ہے۔

بہرحال اردو نظم نگاری کا مستقبل تاب ناک نظر آتا ہوا نظر آتا ہے ۔ کیوں کہ آج کے عہد کے شعرا زیادہ تر دیکھا جائے تو وہ بیک وقت جہاں غزل میں اپنے احساسات کو پیروتے ہیں وہیں نظم کے دامن کو بھی مضبوتی کے ساتھ تھامے ہوئے ہیں ۔ اردو نظم نگاری میں ادھر پندرہ، بیس سال سے ہیئت کے اعتبار سے جو تبدیلی آئی ہے ۔ وہ قابلِ غور ہے ۔ جہاں آج بھی چند شعرا و ناقد آزاد نظم نگاری کو نظم ہی نہیں تسلیم کر رہیں ہیں حالاں کہ آج کے عہد کا کوئی بھی اردو ادبی رسالہ اٹھا کر آپ دیکھ سکتے ہیں۔شاید ہی آپ کو کہیں پابند نظم مل جائے۔ ہر ایک رسالے میں آزاد نظم ہی آپ کو نظر آئیگی۔مگر ادھر چند سالوں میں نثری نظم نے بھی اپنے آپ کو اُجاگر کیا ہے۔جس سے بہت سارے شعرا و ناقد اعتراف و اعتراض کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ آزاد نظم کو نثری نظم سے خطرے کا اندیشہ معلوم ہوتا ہے۔ جب کہ آج کے عہد میں آزاد نظم سب سے اہم اور نمائندہ شعری اظہار ہے۔میرا خیال ہے کہ نثری نظم کے مطالق آنے والا مستقبل فیصلہ کرے گا کہ اسے عروج ملے گا کہ نہیں۔

## حواشی:


۱؎اردو میں نظمِ معرا اور آزاد نظم پروفیسر حنیف کیفی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی۔

۲؎اردو ادب کی تحریکیں ڈاکٹر انور سدید کتابی دنیا دہلی۔

۳؎نظم جدید کی کروٹیں وزیر آغا ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ۔

۴؎اردو شاعری کا مزاج وزیر آغا ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ۔

۵؎ جدید نظم (حالی سے میرا جی تک ) کوثر مظہری، مظہری پبلی کیشن دہلی۔

۶؎رسالا (شاعر) آزاد نظم، پابند نظم اور نثری نظم زاہدہ زیدی جلد (۷۵) شمارہ (۱) جنوری ۲۰۰۴ء۔


☆☆☆

خورشید احمد
اسکالر شعبۂ اُردو
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی حیدرآباد۔۳۲

# وقائع نگاری ۔تاریخ سے پہلے مورخ کو پہچانئے

تاریخ ماضی میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات و حالات کے مجموعے کا نام ہے۔ماضی،حال اور مستقبل ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ماضی کی بنیادوں پر ہی حال و مستقبل کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ماضی ہی کے اوراق میں انسانی زندگی کی تاریخ پوشیدہ ہے۔یہی اوراق اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ انسان ابتدائے آفرینش سے ہی اپنے خیالات ونظریات کو مرتب کرتا آیا ہے۔تاریخ کی ابتدا قصے اور کہانیوں سے ہوئی۔ اس لیے ایک زمانے تک تاریخ،بادشاہوں،بڑے بڑے لوگوں کی سوانح عمریوں،جنگی معرکوں اور سیاسی رموز کے بیان کو ہی سمجھا جاتا تھا۔وقت کے گزرنے کے ساتھ تجربے کو پختگی اور شعور کو روشنی ملی اور انسان نے تاریخی واقعات وحالات کو عقلی و تنقیدی کسوٹی پر پرکھنا شروع کیا،جو باتیں عقلی وتنقیدی معیار پر پوری اتریں وہ تاریخ کا حصہ بن گئیں اور بے معنی اور فضول تفصیلات کو تاریخ سے نکل دیا گیا۔اس طرح تاریخ کو انسانی زندگی کے اہم واقعات وحقائق کا نام دیا گیا ہے۔

لغت میں تاریخ کا معنی 'وقت کی نشاندہی کرنا یا وقت بتانا' ہے اصطلاحًا تاریخ کے معنی وقت بتا کر ماضی کے احوال بیان کرنا ہے۔ماضی میں رونما ہونے والے واقعات،جن کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی اہمیت ہو،کو ترتیب و تدوین کر کے سنہ وار بیان کرنا تاریخ ہے۔تاریخ علم کی وہ شاخ ہے جس سے ماضی کے حالات و واقعات کی بازیافت ہوتی ہے جس سے سماجی ارتقاء کی نشاندہی سلسلہ وار ڈھنگ سے ہوتی ہے۔علامہ شبلی تاریخ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اُن حالات و واقعات کا پتہ لگانا جن سے دریافت ہو کہ موجودہ زمانہ گزشتہ زمانے سے کیوں کر نتیجہ کے بطور پیدا ہوا ہے۔''

تغیر ہر چیز کی بنیادی صفت ہے۔زندگی مسلسل تغیر کے عمل سے گزرنے کی بدولت ہی ہر لحظ اور ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے۔اس میں کہیں بھی سکون اور ٹھہراؤ کا عمل نظر نہیں آتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ سماج ایک نظام سے نکل کر دوسرے نظام میں داخل ہوتا ہے۔آج سماج جس نہج پر ہے اس کے لیے گزشتہ حالات و واقعات نے پس پشت کام کیا ہے۔موجودہ زمانہ گزشتہ زمانے میں تغیر و تبدیلی کے نتیجے کے طور پر ہی پیدا ہوا ہے۔کیوں کہ سماج ایک نظام سے نکل کر دوسرے نظام میں داخل ہوتا ہے۔اس

لیے تاریخی واقعات میں تبدیلی اورارتقاء کی نشاندہی (جس کی بنیاد پر موجودہ سماجی نظام وجود میں آیا) تاریخ کا اصل موضوع ہے۔

تاریخی واقعات اندھیرے میں ہوتے ہیں کیوں کہ وقت سے ماضی کے حالات و واقعات پر تاریکی چھا جاتی ہے۔مورخ ماضی کے حالات و واقعات کو از سرنو ترتیب دے کر روشن کرتا ہے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ماضی کے حالات و واقعات کو از سرنو ترتیب دے کر تفہیم و تجزیہ پیش کرنے میں مورخ کا طریقہ کار کیا ہوتا ہے؟

مورخ کا تعلق اپنے زمانے سے ہوتا ہے اور اپنے دور کے نظریات اور تصورات سے ہوتا ہے۔چنانچہ جو نظریات وتصورات مورخ اپنے زمانے سے حاصل کرتا ہے ،اُن کو ذہن میں رکھ کر ہی وہ تاریخی واقعات و تصورات کی تفہیم وتشریح نیز تجزیہ پیش کرتا ہے۔مورخ کے ذہن میں ماضی سے زیادہ زمانۂ حال کے نظریات ہوتے ہیں۔مورخ اپنے زمانے کے مسائل کا حل تاریخ کے آئینے میں تلاش کرتا ہے۔ جب بھی مورخ کسی دور کی تاریخ مرتب کرنے بیٹھتا ہے تو وہ اُس دور کی پوری زندگی کی تصویر کھینچنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا ،اُسے تو صرف اُن معنی خیز واقعات کو بیان کرنے کا منشاء ہوتا ہے جو مورخ کی فکر و نظر میں حال کے مسائل کے حل اور مستقبل کی تعمیر میں معاون و مددگار ہوں۔اس لیے فلسفۂ تاریخ کا تعلق نہ تو فی نفسہ ماضی سے ہے اور نہ ہی تاریخ کے استنباط سے، بلکہ اس کا تعلق دونوں کے باہمی ارتباط سے ہے۔

ای۔ایچ۔کار تاریخ اور مورخ کے باہمی ربط پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"Before you study the History,Study the Historian....and his historical and social environment."

تاریخ کے مطالعے سے پہلے مورخ کے سماجی اور تاریخی مطالعے پر اس لیے زور دیا جاتا ہے تاکہ مورخ کے نظریات وتصورات سے کماحقہ واقفیت حاصل ہو جائے جس سے تاریخ کے مطالعے میں آسانی ہو جائے اور مورخ کے انداز فکر ونظر کو سمجھنے میں آسانی ہو جائے۔ای۔ایچ۔کار مورخ اور تاریخ کے باہمی ارتباط پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''You can't fully understand or appreciate the work of the historian unless you have first grasped the standpoint from which he himself approached it.(History);Scondly that, that standpoint is itself rooted in a socail and historial background."

مورخ کا میدان ماضی ہوتا ہے لیکن خود اس کی ذات کا تعلق زمانہ حال کی جیتی جاگتی دنیا سے ہوتا ہے۔اس لیے جب تک مورخ کے افکار،نظریات ورجحانات کا صحیح اندازہ نہ ہوگا اُس وقت تک مورخ کے تاریخی تصنیفات کا انداز فکر ونظر کو نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔مورخ کی تاریخی تصنیفات کے انداز فکر و نظر کو سمجھنے کے لیے مورخ کی سماجی اور تاریخی ساخت و پرداخت

کا مطالعہ ناگزیر ہے۔تاریخی حقائق ایک وسیع سمندر میں مچھلیوں کی طرح ہوتے ہیں اور ان کے انتخاب میں بھی مورخ کے نظریات وتصورات کا دخل ہوتا ہے۔مورخ اُن ہی تاریخی حقائق کا انتخاب کرتا ہے جو مورخ کے نظریات وتصورات سے مطابقت رکھتے ہیں۔

تاریخ ایک ایسا عمل ہے جس سے انسانی تہذیب کے ارتقاء کی نشاندہی سلسلے وار ڈھنگ کی جا سکتی ہے اور موجودہ انسانی تہذیب وثقافت اور سماجی رویوں کو سمجھا جاسکتا ہے اور اس کے آئینے میں سماجی مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔موجودہ معاشرے کو سمجھنے کے لیے گزشتہ معاشرت میں تبدیلیوں کی نشاندہی اور تبدیلیوں کے پس پردہ کارفرما عوامل کی نشاندہی ناگزیر ہے۔مورخ کا تعلق زمانہ حال سے ہوتا ہے اس لیے حال کے نظریات وتصورات سے ہی ماضی کے انسانی نظریات وتصورات کی تفہیم وتجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہر تاریخ مورخ کی ہمعصر تاریخ کہلائی جاتی ہے کیوں کہ ہر دور کے مورخ کا بیان اس کے ہمعصر تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے۔ای۔ایچ۔کار نے تاریخ اور مورخ کے باہمی ربط پر ان الفاظ میں بحث کی ہے۔

"It is a continuous process of interaction between the historian and his facts,an unending dialogue between the present and the past."

مورخ کا کام ماضی سے عقیدت اور نہ ماضی سے اپنی شخصیت کو آزاد کرانا ہے بلکہ ماضی کو سمجھنے اور گزشتہ واقعات کے تہہ تک پہنچنے نیز اُن واقعات کی تفہیم وتجزیہ پیش کرنا ہوتا ہے تاکہ زمانہ حال کے رجحانات وتصورات کو سمجھا جا سکتا ہے۔تاریخ میں تفہیم وتوضیح کے فن کی بڑی اہمیت ہے۔تاریخی حقائق کی اہمیت وافایت کا تعین کرنے میں تفہیم وتجزیہ کا اہم کردار ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ کوئی بھی تفہیم و توضیح مکمل نہیں ہوتی ہے البتہ حقیقت نما رائے کی حیثیت رکھتی ہے اور سماجی اداروں اور نظاموں میں تبدیلی کے ساتھ ہی موجودہ حقیقت نما رائے کی اہمیت وافادیت زائل ہو جاتی ہے۔سماجی قدروں ،اداروں اور نظاموں میں تغیر وتبدل کے ساتھ ہی نئی حقیقت نما رائے کی اہمیت اور ضرورت بڑھ جاتی ہے تاکہ تاریخ ،زمانے کے بدلنے کے ساتھ انسانی زندگی سے ہم رکاب ہو سکے۔ اس لیے فن تاریخ میں تفہیم و توضیح کو اہمیت حاصل ہے اور تاریخی حقائق کی اہمیت و افادیت کے تعین میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔فن تاریخ نگاری میں تاریخی حقائق سے زیادہ تفہیم وتجزیہ کی اہمیت ہے۔تاریخی حقائق کی تفہیم وتجزیہ اور توضیح میں مورخ کے نظریات وتصورات کا بڑا دخل ہوتا ہے۔کیوں کہ مورخ کے ذہن میں زمانہ حال اور اپنے ماحول کے جو تصورات و نظریات ہوتے ہیں اُن سے وہ آزاد نہیں ہوسکتا ہے۔یہی وجہ ہے مورخ کسی تاریخی عہد کو زمانہ حال کی عینک سے دیکھتا ہے اور اُس عہد کے واقعات و حالات کو زمانہ حال کے مسائل کے آئینے میں تفہیم وتجزیہ پیش کرتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ علم کی اہمیت مقصد کے حصول تک ہوتی ہے۔فن تاریخ نگاری میں بھی تفہیم وتجزیہ اسی مقصد کے حصول کے مطابق

کام کرتی ہے اور تفہیم و تجزیہ حقیقت نما رائے کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔

تاریخ کیا ہے؟اس کا عام فہم جواب یہ ہے کہ ماضی کی انسانی سرگرمیوں کو چھان بین کے ذریعے از سرنو ترتیب دینے کے عمل کو تاریخ کہتے ہیں۔یہ تاریخی عمل کتابی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی مورخ کی تاریخی تصنیفات کو جانچنے کے پیمانے کیا ہوتے ہیں؟کسی مورخ کی تاریخ نویسی کو دوسرے مورخین کی تصنیفات سے موازنہ کے علاوہ کوئی اور پیمانہ نہیں ہے جس سے مورخ کی تاریخی حقیقت کو جانچا جا سکتا ہے کیوں کہ مورخ جن تاریخی لوگوں ،عہد اور معاشرت کا انتخاب کرتا ہے وہ لوگ،زمانہ اور معاشرت جانچ و پڑتال کے لیے واپس نہیں بلائے جا سکتے ہیں جن کی روداد مورخ بیان کرتا ہے اور دوسری بات یہ کہ جو نشانات،کتبات،تحریرات کسی عہد کے لوگوں اور معاشرت نے مورخین کے لیے پیچھے چھوڑ دیئے ہیں، وہ ہر پہلو سے اُس عہد کی انسانی سرگرمیوں کی تصویر پیش نہیں کرتے ہیں اس لیے مورخ کی تاریخ نویسی میں ذاتی قیاس بھی شامل ہوجاتا ہے۔یہ قیاس ماضی کی انسانی سرگرمی سے مشابہت اور مناسبت بھی رکھتا ہوگا اور غیر مشابہت بھی کیوں کہ قیاس آرائی میں سچائی اور جھوٹ دونوں کا امکان ہوتا ہے۔قیاس آرائی میں بھی مورخ کے ذاتی نظریات وتصورات کارفرما ہوتے ہیں۔اس لیے کسی بھی مورخ کی تاریخ نویسی کا مطالعہ کرنے سے پہلے مورخ کا مطالعہ ناگزیر ہے کیوں کہ تاریخ اور مورخ ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔

تاریخ مورخ کے بغیر مردہ اور مورخ تاریخ کے بغیر غیر اہم ہے۔تاریخ کی اہمیت اور روشنی مورخ کی علمیت اور محنت سے عیاں ہوتی ہے اور مورخ کی اہمیت وعلمیت کا احساس تاریخ سے اجاگر ہوتا ہے۔ہر مورخ اپنے ذاتی محرکات کی بنا پر تاریخ کے بارے میں ایک نیا احساس اور تجربہ رکھتا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ اپنے سے پہلے آنے والے مورخین اور مفکرین کے تاریخی نظریات اور تصورات سے متاثر بھی ہوتا ہے۔اس سے مورخ کی ذہنی ساخت ہوتی ہے اور اس طرح سماج کے مجموعی تاریخی شعور کے ارتقاء میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔تاریخ میں معاشرے کے مسلسل ارتقاء اور تہذیب وتمدن کے اُن مراحل کی نشاندہی ہوتی ہے جن سے تہذیب ومعاشرے کے اداروں اور نظاموں میں تغیر وتبدیلی آئی ۔مورخ ان عوامل اور مراحل کی نشاندہی میں ذاتی محرکات ورجحانات کو شعوری یا غیر شعوری طور پر کام میں لاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ مورخ کی تاریخی اور سماجی ماحول کا مطالعہ ناگزیر ہے تاکہ اُن محرکات اور اثرات کا پتہ لگایا جا سکے جن کی بنیاد پر مورخ کا تاریخ کے بارے میں ایک نیا نظریہ اور احساس پیدا ہوا جس کی بنیاد پر مورخ سماج کے مجموعی تاریخی شعور کے ارتقاء میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔تاریخی حقائق اندھیرے میں ہوتے ہیں اور مورخ اُنہیں روشن کرتا ہے۔ تاریخ مورخ کے بغیر خاموش غیر اہم ہوتی ہے۔مورخ کی اہمیت وعلمیت تاریخی شعور سے اُجاگر ہوتی ہے۔

☆☆☆

محمد ذاکر حسین
فاضل سوّم
جامعہ نظامیہ، شبلی گنج، حیدرآباد

# شیخ الاسلام بحیثیتِ نعت گو شاعر

انیسویں صدی ملک وملت کی جن ممتاز ترین اور عظیم المرتبت شخصیتوں پر فخر کرسکتی ہے ان میں ایک عہد آفریں شخصیت شیخ الاسلام، عارف باللہ، فضیلت جنگ حضرت مولانا حافظ امام محمد انوراللہ فاروقی علیہ الرحمہ (بانی جامعہ نظامیہ حیدرآباد) کی ہے۔ آپ کی شخصیت کو جنوبی ہند میں ہی نہیں بلکہ برصغیر اور تمام عالم اسلام میں خاص امتیاز رہا۔

دکن کا علاقہ ابتداء ہی سے علم وادب کا گہوارہ رہا ہے جس میں بطورِ خاص حیدرآباد وہ شہر ہے جس کے بنیادی مقاصد میں علم و ادب بھی شامل ہے، جس کی خوبصورتی صرف فنِ تعمیری سے ہی نہیں بلکہ علم و ادب، شعر و شاعری، رشد و ہدایت ہر اعتبار سے ہے۔ اسی شہر کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ''قلی قطب شاہ'' اسی دکن کا باشندہ ہے اور پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ ''مالقا'' بھی اسی دکن کی خاتون ہے۔ اور اسی سرزمینِ دکن کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اس سرزمین پر اولیاءِ کرام، علماءِ دین، مشائخ عظام، مفتیانِ کرام، ادباء شعراء، بالخصوص نعت گو شعراء پیدا ہوئے ہیں۔

حیدرآباد کی سرزمین پر نعت گوئی کا پرچم بلند کرنے والوں میں حضرت شیخ الاسلام امام محمد انوار اللہ فاروقی علیہ الرحمہ کی شخصیت بھی ایک ہے۔

**☆ حضرت شیخ الاسلام کی شاعری کا محور و مرکز:**

شیخ الاسلام کی شاعری کے محور و مرکز کو بتلاتے ہوئے ڈاکٹر عقیل ہاشمی رقمطراز ہیں:

''حضرت شیخ الاسلام کی شاعری کا محور و مرکز حضور رسالت مآب ﷺ کی ذات گرامی ہے۔ آپ نے اپنے اشعار سے جس والہانہ وابستگی کا شعار بتلایا وہ دیدنی ہے، سچ تو یہ ہے کہ ''عشقِ رسول ﷺ دیگر است'' والا معاملہ ہے'' (شیخ الاسلام امام محمد انوراللہ فاروقی بحیثیت شاعر آگاہ شخصیت، بقلم: ڈاکٹر عقیل ہاشمی، مرقع انوار، ص ۳۶۵)

اور ''سید جمال اللہ قادری صدر طلباء قدیم جدّہ لکھتے ہیں کہ'' حضرت شیخ الاسلام کے علمی وقلمی احسانات ناقابلِ فراموش ہیں۔ آپ نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ

اسلام کی سر بلندی اور معاشرے کی اصلاح کے لیے محض اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی رضا کے لیے وقف کر دیا تھا''۔ (روز نامہ رہنمائے دکن ۲۰ مارچ ۲۰۱۵ء بقلم: سید جمال اللہ قادری)

**☆ حضرت شیخ الاسلام کی نعت گوئی کا مقصد' خود آپ علیہ الرحمہ کے اشعار میں:**

جن مبارک ہستیوں نے نعت گوئی جیسی عظیم صنف کو حضور ﷺ کی مدح سرائی اور آپ کی شان وعظمت بتانے اور محض حضور ﷺ کی رضا کی خاطر اختیار کیا ان میں شیخ الاسلام کی ذات بھی ہے ۔شیخ الاسلام کی شاعری برائے شاعری نہیں بلکہ عبادت ہے۔ چنانچہ آپ نے اپنے مقصد کا اسطرح اظہار فرمایا ہے:

لکھا اس نظم کو ہر چند میں شاعر نہیں
کیونکہ خوش ہوتے تھے اکثر نظم ہی سے شاہِ دیں
تھا یہی لم جو ممد حسّان کے تھے روح الامین
کعب اور ابن رواحہ کو اسکا تھا یقیں
ذکر ختم المرسلین اس نظم سے مقصود ہے
جو ازل سے تا ابد ممدوح و محمود ہے

ooo

حضرت شیخ الاسلام نے شاعری کو اپنایا اور اسکے جواز کو ثابت کر بتایا' اور اسکے جواز میں صحاح ستہ سے ترمذی و نسائی اور دیگر کتب کے احادیث جمع فرمائے۔ چنانچہ حضرت قطب معین الدین انصاری ان اشعار کی مختصر تشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

'' حضرت مولانا نے ان احادیث سے استدلال کرتے ہوئے اشعار با ثواب کے کہنے' سننے اور اصلاح دینے کا جواز ثابت کر دیا۔ اور خوش ہو کر شاعر کو شعر کا صلہ دینا سنت نبوی ﷺ قرار دیا۔ علی ہذا روح الامین (جبرائیل علیہ السلام) کا شاعر حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا ہم نوا ہونا اور مسجد نبوی ﷺ میں اشعار سنانا' ان کے لیے منبر کا رکھوانا بہت ساری دلیلیں عالمانہ انداز میں آپ نے بیان فرمائیں'' (شیخ الاسلام محمد انوار اللہ فاروقی علیہ الرحمہ کلام الانوار' انوار الکلام' بقلم: قطب معین الدین انصاری' مرقع انوار .ص ۸۶۰)

**☆ حضرت شیخ الاسلام کے کلام میں جذبۂ وارفتگی' پختگی' عشق وسرمستی:**

حضرت شیخ الاسلام کے کلام میں جذبۂ وارفتگی' پختگی' عشق وسرمستی پائی جاتی ہے جیسا کہ حضرت سید شاہ اعظم علی صوفی قادری رقمطراز ہیں: '' آپ کی ہمہ پہلو شخصیت اپنی ذات میں ایک انجمن تھی' مفتی' محدث' مفسر و مفکر' مصنف ومولّف' خطیب و ادیب اور صوفی وعارف ہونے کے ساتھ ساتھ ایک قادر الکلام شاعر وسخنور بھی تھے کے جنکے عشقِ رسول ﷺ میں ڈوبے ہوئے کلام کو پڑھ کر جامی قدس سرہ السامی کے جذبۂ وارفتگی کی یاد تازہ ہوجاتی ہے'' (انتخاب دیوان انوار' ص ۱۹)

اسی طرح عصرِ حاضر کے مشہور ومقبول' نامور اور معتبر ادیب و شاعر' ناقد اور عروضی پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے مولانا انوار کی شاعری کے بارے میں اپنی

رائے کا یوں اظہار کیا ہے:

''علامہ انواراللہ انورؔ کے کلام میں کلاسکی، پختگی اور مشاّقی قدم قدم پرنمایاں ہے' زبان نہایت ٹکسالی اور بامحاورہ ہے'' (جامعہ نظامیہ حیدرآباد کا علمی وعملی منظر نامہ' بقلم :عظمت اللہ خاں قادری احساسؔ 'ص ۶۸'۔ و روز نامہ رہنمائے دکن ۲۰ مارچ ۲۰۱۵' بقلم شاہ محمد فصیح الدین نظامی)

حضورﷺ کے مبارک ابرو کی جنبش کی تاثیر اورحبیب پاکﷺ کے کلام کی شگفتگی کو یوں بیان کرتے ہیں:

نہ خنجر پاس ہے ان کے نہ وہ شمشیر رکھتے ہیں
مگر ابرو کی جنبش میں عجب تاثیر رکھتے ہیں
نہیں رہتا ہے دل قبضہ میں انکی ہم کلامی سے
نہیں معلوم باتوں میں وہ کیا تاثیر رکھتے ہیں

ooo

## ☆ حضرت شیخ الاسلام کا شعری و ادبی ذوق اور آپ کی انکساری:

حضرت شیخ الاسلام کے شعری ذوق کے متعلق آپکے شاگرد رشید مفتی رکن الدین علیہ الرحمہ (مفتی اوّل جامعہ نظامیہ) فرماتے ہیں:

''مولانا علیہ الرحمہ شاعر نہیں تھے' تصوف کے لگاؤ کے باعث جو خیالات و جذبات اٹھتے تھے ان کو کبھی کبھی نظم فرمادیا کرتے تھے۔آپ کا کلام یقیناً عام کلام کے مطابق نہ ہوگا البتہ وہ لوگ جو صوفیانہ مذاق رکھتے ہیں ضرور اس سے حظ (لطف) اٹھائیں گے۔کلام کا اکثر حصّہ توحید و نعت میں ہے'' (مطلع الانوار'ص ۶۹ 'ناشر مجلس اشاعۃ العلوم جامعہ نظامیہ' سنہ ۱۴۳۵ھ ۲۰۱۴ مارچ)

اسی طرح مشہور محقق اکبر الدین صدیقی بھی مولانا انواراللہ شاہ کی شاعری کے معترف تھے۔ان کی شاعری کے بارے میں وہ اسطرح اظہار خیال کرتے ہیں:

''مولانا کہنہ مشق شاعر نہ تھے' لیکن جذبات کے اظہار کے لیے جو تصوف میں ڈوبے ہوئے تھے بہترین ذریعہ اشعار ہیں اوراسی بناء پر وہ مجبوراً شعر کہتے تھے''۔

اورمزید لکھتے ہیں:

''مولانا کی زندگی کے واقعات کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کی عدم الفرصتی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن اس پر بھی مولانا اپنے وقت کے سب سے بڑے مصنف ہیں۔آپ نے جتنی کتابیں اس زمانے میں لکھیں ان سے حیدرآباد کی ادبیات میں انقلاب پیدا ہوگیا'' (مشاہیر قندہار' از: محمد اکبرالدین صدیقی 'ص ۱۰۰' ناشر مجلّہ الموسی قندہار' سنہ ۱۳۵۵ھ)

حضرت شیخ الاسلام خود اپنی شاعری کے بارے میں فرماتے ہیں:

''ہر چند فن شاعری میں نہ کسی سے تلمذ ہے' نہ مہارت' نہ اہل ہند کے محاورات سے واقفیت مگر صرف اس لحاظ سے کہ یہ خدمت غالبًا مناسب مقام ہے اور تعجب نہیں کہ اسلام سے اسکو کچھ فائدہ حاصل ہو چند اشعار لکھے''۔(انواراحمدی ص ۷)

ڈاکٹر محمد عظمت اللہ خان قادری احساؔس لکھتے ہیں کہ:

''مولانا کا یہ کہنا کہ فن شاعری میں مہارت نہیں' محاورات اہل ہند سے واقفیت نہیں وغیرہ یہ سب از راہِ انکساری تھا ورنہ درحقیقت یہ ہے کہ مولانا شاعری کے سارے مسائل ولوازمات سے واقف تھے''۔

مولانا کس درجہ کے شاعر تھے اس بات کو ابوالخیر گنج نشین علیہ الرحمہ شیخ الاسلام کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔الفاظ ملاحظہ ہوں:

''وہ اپنے عہد کے علمی ہمہ دانست بہت اچھے نمونہ تھے اور عربی فارسی اور اردو کے اعلی پایہ کے شاعر تھے''(جامعہ نظامیہ حیدرآباد کا علمی و ادبی منظرنامہ' بقلم: ڈاکٹر عظمت اللہ خان قادری احساؔس' ص۶۲)

☆ حضرت شیخ الاسلام کی شاعری اور نعتیہ غزلوں کا مجموعہ:

حضرت شیخ الاسلام مولانا محمد انوار اللہ فاروقی کے علمی وادبی کارناموں میں ان کی شاعری بھی اہمیت کی حامل ہے ۔مولانا انوار اللہ نے شعر گوئی کا آغاز ''انوارِاحمدی'' کے منظوم متن سے کیا جو باسٹھ (۶۲) مسدسات پر مشتمل ہے جسمیں حضورﷺ کے فضائل ومعجزات اور میلاد شریف کے موضوعات شامل ہیں۔اور ساتھ ہی قرآن وحدیث کی روشنی میں شرح فرمائی جو تین سو نود (۳۹۰) صفحات پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر عبدالحمید اکبر پروفیسر اردو گلبرگہ یونیورسٹی اپنے تحقیقی مقالہ میں لکھتے ہیں کہ'' آپ نے اہل اسلام کے فائدے کے پیش نظر چند اشعار لکھے جن کا ہر لفظ حب رسولﷺ کی صدا دیتا ہے انہی چند اشعار کی نثری وضاحت کا نام ''انوار احمدی'' ہے۔ انوارِ احمدی کے شعری متن کے علاہ مولانا کا ایک مجموعہ کلام ''شمیم الانوار'' کے نام سے شیخ الاسلام کے وصال کے بعد اشاعت العلوم سے طبع ہوا۔اس مجموعہ میں فارسی کی (۲۴) نعتیہ غزلیں' ایک قصیدہ نعتیہ' اور سینتیس (۳۷) اشعار پر مشتمل ہے (شیخ الاسلام محمد انوار اللہ فاروقی شخصیت علمی و ادبی کارنامے' مصنف: عبد الحمید اکبر' ص۱۵۵'۱۵۶' ناشر: مجلس اشاعۃ العلوم' سنہ۲۰۰۰ھ)

اور ہندوستانی ادب کے معمار' ممتاز مورخ ومحقق' نقاد وادیب اور کئی کتابوں کے مصنف ڈاکٹر سید احمد محی الدین قادری زوؔر اپنی کتاب 'داستان ادب حیدرآباد میں رقمطراز ہیں:

''علوم اسلامیہ کے ماہر پچاس سے زیادہ کتابیں مختلف موضوعات پر لکھیں اور چھپائیں اردو اور فارسی کے شاعر بھی تھے۔اور انورؔ تخلص کرتے تھے۔ان کے کلام کا مجموعہ ''شمیم الانوار'' چھپ چکا ہے اور دوسرے مجموعے کا قلمی نسخہ ادارۂ ادبیات اردو میں محفوظ ہے (شیخ الاسلام معمارِ اردو زبان وادب' روز نامہ رہنمائے دکن' ۲۰ مارچ ۲۰۱۵' بقلم: شاہ محمد فصیح الدین نظامی مہتمم کتب خانہ جامعہ نظامیہ) اور دوسرے مجموعہ کلام کا نام ''کلامِ انوؔار'' ہے جو ڈاکٹر محی الدین قادری زوؔر کا قائم کردہ ادارہ ''ادبیات اردو'' میں ادارہ ادبیات اردو کی مہر کے اوپر اس قلمی نسخہ کا نمبر (۳۸۹) درج ہے۔

(انتخاب از دیوانِ انوار، ص۱۰، تدوین و ترتیب.شاہ محمد فصیح الدین نظامی، طباعت .انور گرافکس، سنہ۔ مارچ ۲۰۱۳م۱۴۳۴ھ)

فاروق عارفی نے لکھا ہے کہ حضرت شیخ الاسلام اردو اور فارسی دونوں میں اشعار کہے ہیں اور آپ کی شاعری نعت یا پھر تصوف و اخلاق پر مبنی ہے۔اولیاء و صوفیاء کی شاعری کا طرز نعتیہ اشعار یا تصوف و اخلاق پر مبنی اشعار کہنا رہا ہے'' (حد درجہ کمال، بقلم: قاضی فاروق عارفی، روزنامہ سیاست ۱۷اپریل ۲۰۱۴)

حضرت شیخ الاسلام کے نعتیہ اشعار بطورِ نمونہ اور ان کا پس منظر پیشِ خدمت ہے۔

حضور ﷺ کی میلاد پاک کہ جس کی برکت سے ظلمت کی آندھیاں چھٹ گئیں اور تمام عالم اس نورِ پاک سے روشن ہوئے اور زمین کا ذرہ ذرہ خوشیاں منانے لگا تو اس حسیں منظر کو حضرت شیخ الاسلام نے اس طرح ذکر فرمایا:

پس وہ نورِ پاکِ رب العلمین پیدا ہوئے
مبداءِ کونین ختم المرسلین پیدا ہوئے
جانِ عالم قبلۂ اھلِ یقین پیدا ہوئے
شکر ایزد رحمۃ للعلمین پیدا ہوئے
دھوم تھی عالم میں خورشیدِ کرم طالع ہوا
ہاں کریں تعظیم اب نورِ دم طالع ہوا

ooo

اور جو شخص حضور ﷺ پر ایک بار درود پڑھتا ہے اس پر اللہ ستّر رحمتیں بھیجتا ہے۔اور جو کثرت سے درود پڑھتا ہے اس کے مدارج میں تو ترقیاں ہی ترقیاں ہیں جس کو شیخ الاسلامؒ نے اس طرح نظم فرمایا ہے:

کیا فضیلت ہے پڑھے یکبار گر کوئی درود
بھیجتا ہے اس پہ ستر رحمتیں ربّ ودود
اور ملائک کے درود اس پر کریں پیہم وُرود
ہو مدام اس کی ترقی مدارج زُود زُود

ooo

**☆حضرت شیخ االاسلام کی شاعرانہ خصوصیت، اور آپکی شاعری میں اسرار و معارف:**

شاعر کی حیثیت سے حضرت شیخ الاسلام نے اس حقیقت کو واضح فرمایا جیسا کہ ارشاد نبوی ﷺ ہے''اِنَّ مِنَ الشِعْرِ لَحِکْمَۃ''(الحدیث)۔ویسے بھی علماء ربانی اور صوفیاء عظام کی شاعری شاعری نہیں بلکہ وہ سراپا راز و نیاز، پند و نصائح، محبتِ خدا اور محبتِ رسول ﷺ کی شرح ہوتی ہے۔

ڈاکٹر عبد الحمید اکبر شیخ الاسلام کی شاعرانہ خصوصیت کے متعلق تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں''مولانا انوار اللہ کی شاعری میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو ایک اچھے شاعر میں ہونی چاہیے۔ان کی شاعری مجموعی طور پر صوفیانہ ہے جس میں زیادہ تر مظاہرِ قدرت کی عکاسی نظر آتی ہے اور یہ ہماری شاعری کا مزاج بھی رہا ہے۔خواجہ میر دردؔ کے کلام میں صوفیانہ افکار کی جلوہ گری زیادہ ہے دردؔ کے انہی افکار کو مزید سہل بنا کر مولانا انوار اللہ انورؔ نے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔علامہ انورؔ کی زبان دانی مسلّم

ہے' ان کا کلام اغلاط سے پاک ہے۔ زبان کی صفائی کے ساتھ ساتھ فصاحتِ رندانہ روزمرہ' بے تکلفی ان کے کلام میں دلکش پیرائے میں ملتے ہیں۔ ان تمام مذکورہ شعری لوازمات کے پیشِ نظر حضرت انورؔ اپنے طرز خاص کے موجد ہیں جس میں حسنِ ادا کا پہلو بالکل فطری ہے'' (ڈاکٹر عبدالحمید اکبر' حضرت مولانا انوار اللہ فاروقی شخصیت علمی و ادبی کارنامے' ص ۳۰۱)

حبیب پاک ﷺ کے ظہور کے متعلق آپ نے اس طرح ادب واحترام سے فرمایا۔

یعنی جب خالق نے چاہا غیب کا اظہار ہو
اور عبودیت کا ساری خلق میں اقرار ہو
فیض بخش کُن فکاں گنجینہء اسرار ہو
کنج تاریک عدم جولانگہِ انوار ہو

ooo

**☆ حضرت شیخ االاسلام کا اسلوب:**

حضرت شیخ االاسلام کے اسلوب کے متعلق ڈاکٹر عقیل احمد ہاشمی رقمطراز ہیں:

''علامہ کے اسلوب میں بیک وقت منطقی ترتیب' اشارات استدلال' جمالیاتی تہذیب' عقیدت و محبت کی چاشنی کا احساس نمایاں ہوگا اسکے علاوہ فکری اجتہاد واختراع کا وصف زبان وبیان کی خوبیاں مترشح ہوتی ہیں۔ سیدھے الفاظ وتشبیہات واستعارات یا اور دوسری صنعتیں ان میں بڑی حکیمانہ انداز سے سموئی ہیں۔ بہ الفاظ دیگر حضرت شیخ الاسلام کی شاعری دل و دماغ کو آسودہ ہی نہیں کرتی بلکہ ایمان وایقان کی منزلوں سے قریب کردیتی ہیں۔ ان میں استفسار اور تامل کی تازگی اور عشقِ محمدی ﷺ کا پاکیزہ احساس بھی ہے۔ گویا مومن کی فراست اسکی بصیرت' دردمندی' اخلاص' معاشرۂ اسلام کی تابنا کی سبھی کچھ ہے (شیخ الاسلام امام محمد انور اللہ فاروقی بحیثیت شاعر آگاہ شخصیت' بقلم: ڈاکٹر عقیل ہاشمی' مرقع انوار' ص ۸۶۸'۸۶۹)

**☆ حضرت شیخ الاسلام کی نعتیہ شاعری کے نمونہ کلام و پس منظر:**

حضرت شیخ الاسلام کے نعتیہ اشعار بہت سارے ہیں ان میں سے چند اشعار بطورِ نمونہ اور ان کا پس منظر پیشِ خدمت ہے۔

وسیلہ کے منکرین کو جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تم کیسے وسیلہ کا انکار کرتے ہو جبکہ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنی ذرّیت کو یہ طریقہ بتلایا جب آپ کو زمین پر اتارا گیا تو آپ نے حضور ﷺ کے اسم مبارک کو وسیلہ بنایا اور حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی اور وحشت بھی ختم ہوگئی۔

توبہ حضرت صفی اللہ قبول اس دم ہوا
کہ وسیلہ شاہِ دیں کے نام اطہر کو کیا
وحشتِ آدم گئی ذکر شہِ لولاک سے
مردے زندہ ہوگئے تاثیر نامِ پاک سے

ooo

اور حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے صاحبزادے حضرت شیث علیہ السلام کو وصیت کی کہ حضور

ﷺ کا ذکر کیا کرو کیونکہ یہ نام آسمانوں پر، فرشتوں کی پیشانیوں پر، جنت کے پتوں پر، حوروں پر اور عالمِ علوی میں لکھا دیکھا۔ اور فرشتے ذکر محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں مصروف ہیں۔ اسی کو شیخ الاسلام نے اس طرح اشعار میں ڈھالا ہے:

بوالبشر نے کی وصیت وقت آخر شیث کو
کہ قرین ذکر حقِ ذکرِ محمد کیجو
دیکھا ذکر احمدی میں ہر ملک مصروف تھا
اور ہر ایک پتہ پہ جنت کے نام ان کا لکھا
سینے حوروں کے ملائک کی جبینیں تا بعرش
ہر جگہ اس نام کا ہے عالم علوی میں نقش

ooo

حضرت شیخ الاسلام ''ذِکْرُ الْصَّالِحِینَ تَنْزِلُ الْرَحْمَۃُ'' (الحدیث)۔ کے تحت فرماتے ہیں کہ جب اولیاء اللہ کا ذکر رحمتِ خدا کا سبب ہے تو جن کا ذکر گویا خدا کا ذکر ہے تو ان کے ذکر کا کیسا مرتبہ ہوگا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے ذکر کی رفعت، جس کو کلام اللہ نے وَرَفَعْنَالَکَ ذِکْرَک کہا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی کیا شان ہوگی۔

شیخ الاسلام گویا ہوئے:

ٹھرا کفارہ گناہوں کا جو ذکرِ اولیاء
اور از قسم عبادت ہو جو ذکرِ انبیاء
پھر ہو ذکر سرورِ عالم کا کیسا مرتبہ
جن کا ذکرِ پاک ہے گویا کے ذکرِ کبریا

رفعِ ذکرِ پاک ثابت ہے کلام اللہ سے
مطمئن ہوتے ہیں دل ذکرِ شہِ لولاہ سے

ooo

کہیں ایسے اشعار کو لوگ عقیدت و محبت میں غلو نہ کہدیں اس لیے شیخ الاسلام نے شعر ہی میں وضاحت فرمائی کہ یہ عقیدت و محبت میں غلو نہیں بلکہ یہ تمام اشعار قرآن پاک اور احادیث کریمہ کی روشنی میں نظم کئے گئے ہیں: آپ نے فرمایا:

گرچہ یہ اشعار ہیں پر شاعری اس میں نہیں
ترجمہ منقول کا ہے خودسری اس میں نہیں

''العاقل تکفیہ الاشارۃ'' کے تحت حضرت شیخ الاسلام کے ان چند نعتیہ اشعار سے بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کس درجہ عظیم المرتبت ''نعت گوشاعر'' ہیں کہ آپ نے عناوین جمیلہ کو کسقدر رعمدگی سے اشعار کا جامہ پہنایا۔ اور اسی طرح خوبصورت عناوین کے تحت بہت سارے اشعار ہیں جن کا اس مختصر مضمون میں جائزہ لینا ممکن نہیں۔ جب آپ کے تمام اشعار کا جائزہ نہیں لیا جاسکتا تو آپ کا ''بحیثیت نعت گو شاعر'' اور آپ کی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت گزار زندگی کا کس طرح جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر طیب پاشاہ قادری نے شیخ الاسلام کی ہمہ پہلو شخصیت کے متعلق کیا خوب کہا:

کوئی بھلا کیا لے سکے گا جائزہ انوار کا
دور تک پھیلا ہوا ہے دائرہ انوار کا

☆☆☆

عبیدالرحمٰن
ریسرچ اسکالر
شعبۂ اردو
یونی ورسٹی آف حیدرآباد، گچی باولی، حیدرآباد۔تلنگانہ

# عصمت چغتائی کی رپورتاژ نگاری

ترقی پسندوں نے اردو کو تین تحفے دیئے ،افسانہ، آزاد نظم اور رپورتاژ۔لہذا بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ رپورتاژ نگاری ترقی پسند تحریک کے زیر اثر فن کی صورت و شکل میں رونما ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے مقبولیت کا درجہ حاصل کر لی ،اس کا ظاہری سرا صحافت سے ملتا ہے اور بقول سردار جعفری:

'' یہ صنف ادب رپورتاژ بالکل نئی ہے لیکن بے انتہا اہم ہے صحافت اور افسانہ کی درمیانی کڑی ہے۔''

یہ لفظ لاطینی اور فرانسسی زبانوں reportage سے اخذ کیا گیا ہے جو انگریزی میں رپورٹ کے ہم معنیٰ ہے۔رپورٹ عموماً کسی پروگرام کی روداد بیان کرنے کو کہا جاتا ہے۔اگر کسی پروگرام یا محفل کی رپورٹ میں ادبی اسلوب، تخیل کی آمیزش اور معروضی حقائق کے ساتھ ساتھ باطنی لمس بھی عطا کیئے جائیں تو یہ ادبی صنف کہلاتی ہے۔ اس کے متعلق ارشاد احمد خاں رقم طراز ہیں:

'' رپورتاژ کی پہچان اس کی اپنی ہیئت سے زیادہ اس کے اظہار میں پوشیدہ ہے۔اس کی صنف میں کوئی بھی گزرا ہوا واقعہ اظہار کی تہوں تک پہنچتا اور تخلیق کار کے اندر چھپے ہوئے رومانی احساس کو جگاتا ہے اور مصورانہ چابک دستی کے ساتھ ایسی تخلیق کو اجاگر کرتا ہے جو واقعات کی لپیٹ میں مرقع کاری کا درجہ رکھتی ہے، رپورتاژ کو ایک غیر افسانوی صنف کا درجہ حاصل ہے جس میں افسانویت اور کہانی پن کا وجود نہیں ہوتا بلکہ گزرے ہوئے واقعات کی دلچسپ انداز میں تصویر کشی ہوتی ہے۔''

پروفیسر گیان چند جین نے رپورتاژ کی تعریف اس طرح بیان کی ہے:

''کسی تقریب کی کاروائی کا قرار واقعی غیر ادبی ،غیر جذباتی بیان، روداد کہلاتی ہے۔ایک انشائیہ نگار اسے بیان کرے تو ایک افسانوی شخصی ادبی رنگ سے بیان کرے گا، یہ رپورتاژ ہے جو تخلیقی ادب پارہ ہوتا ہے، یہ کسی تقریب ،تقریب سے متعلق سفر کے واقعے کے بیان پر مشتمل ہوتا ہے،اس میں دو چار آٹھ دس دن سے زیادہ کا بیان نہیں ہوتا''

رپوتاژ میں ادبی چاشنی کے ساتھ ساتھ زندگی کے اسرار سے پردے اٹھائے جاتے ہیں رپورتاژ میں

واقعہ نگاری، منظر نگاری، کردار نگاری، جذبات نگاری، اور جزئیات نگاری کے اچھے نمونے پیش کیئے جا سکتے ہیں، درحقیقت رپورتاژ اپنے عہد کی دستاویز کہلاتا ہے، ڈاکٹر مجید بیدار رقمطراز ہیں:

''رپورتاژ کے اجزاء لازم پانچ ہیں جن کے تحت کسی محفل کا آنکھوں دیکھا حال، سرگرمیوں کا احاطہ، منظری رویہ، ہلکے پھلکے طنزیہ پیکر کا سہارا لیا جاتا ہے۔ جس میں جزئیات نگاری کی شمولیت ضروری ہے''

رپورتاژ کی ہئیت اور اجزا کیا ہو سکتے ہیں اس پر روشنی ڈالتے ہوئے ارشاد احمد خان لکھتے ہیں:

''رپورتاژ کی رپورٹ روزنامچہ اور دیگر نثری اصناف سے ممتاز اور مہمیز کرنے کے لیے کسی بھی متن میں حسب ذیل اصولوں کی جانچ ضروری ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ رپورتاژ نگاری کا فن اور اس کا اظہار حسبِ ذیل عنوانات کے ساتھ ممکن ہے۔ ا۔ اسلوب ۲۔ ہئیت ۳۔ صحافت ۴۔ رومانیت ۵۔ افسانویت ۶۔ واقعیت ۷۔ قوتِ تحریر ۸۔ اقتباسِ عمل ۹۔ جبریہ انداز''

ترقی پسند ادیبوں نے ترقی پسند تحریک کے کانفرنسوں اور اجلاسوں کی روداد رقم کی اور اس کو ادبی چاشنی کے ساتھ شائع کرنا شروع کیا۔ تب سے اردو ادب میں رپورتاژ کی روایت قائم ہوئی۔ قدوس صہبائی کے ہفتہ وار اخبار ''نظام'' میں حمید اختر نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے کی روداد کو لکھا، اس روداد کو ہی اردو ادب میں رپورتاژ نگاری کا آغاز سمجھا گیا، اور پھر سجاد ظہیر کو اردو ادب میں اس صنف کا بانی کہا جاتا ہے ان کی ''یادیں'' 1940ء میں شائع ہوئی جسے اردو کا پہلا باقاعدہ رپورتاژ قرار دیا گیا پھر کرشن چندر کے رپورتاژ ''پودے'' کو مانا جاتا ہے، انہوں نے ''صبح ہوتی ہے'' کے نام سے بھی ایک رپورتاژ لکھی تھی لیکن پودے کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی، پرکاش پنڈت نے کلکتہ میں منعقد ہونے والی کانفرنس کی رپورٹ ''کہت کبیر سنو بھائی سادھو'' کے عنوان سے لکھی۔ بھوپال میں منعقد ترقی پسندوں کی کانفرس کی دو رپورتاژ لکھی گئی، صفیہ اختر نے ایک ''ہنگامہ'' اور عصمت چغتائی نے ''بمبئی سے بھوپال تک'' کے عنوان سے لکھا۔

عصمت چغتائی 1915ء سے 1991ء اردو کی بہترین افسانہ نگار اور ناول نویس ہیں انہوں نے متعدد یادگار افسانے اور ناولیں لکھی ہیں، ''دوزخی'' کے نام سے اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی کا جو خاکہ لکھا ہے وہ اگر چہ بنیادی طور پر ایک اچھا اور کامیاب خاکہ ہے لیکن اس میں رپورتاژ کے عناصر بھی پائے جاتے ہیں، اس کے علاوہ ان کے کئی ایک افسانوں میں بھی رپورتاژ کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

اس طرح عصمت چغتائی کی شخصیت ہمہ جہت معلوم ہوتی ہے، جس صنف پر قلم اٹھاتی ہیں اس کا حق ادا کر دیتی ہیں، جو کچھ لکھتی ہیں اس میں بڑی جان ہوتی ہے، چاہے افسانہ نگاری ہو یا پھر ناول نگاری، خاکہ نگاری ہو یا پھر زیرِ بحث رپورتاژ نگاری۔

عصمت چغتائی نے اگر چہ ایک ہی باقاعدہ رپورتاژ لکھی ہے لیکن جس طرح خاکہ ''دوزخی'' لکھنے کی وجہ سے اردو خاکہ نگاری میں اپنی جگہ بنالی ہے اسی طرح صرف ایک رپورتاژ نگاری کر کے اردو رپورتاژ نگاری میں اپنی رپورتاژ نگاری کا لوہا بھی منوا لیا ہے ان کے اس رپورتاژ کا عنوان ہے ''بمبئی سے بھوپال تک'' یہ دراصل 1952ء میں بھوپال میں منعقد ہونے والی کل ہند کانفرنس کی روداد ہے جس میں وہ خود شریک ہوئی تھیں۔ بمبئی سے بھوپال تک ان کا مشہور زمانہ رپورتاژ ہے۔ اس رپورتاژ میں عصمت چغتائی نے جس قسم کی کردار نگاری منظر کشی اور لوگوں کی گفتگو کو عینی شاہد کی حیثیت سے پوری صداقت اور بے باکی کے ساتھ زبان و بیان کی لطافت سے پر کر کے اس کانفرنس کی روداد بیان کی ہے اس سے ان کی یہ رپورتاژ بمبئی سے بھوپال تک اردو رپورتاژ نگاری کا اعلیٰ نمونہ بن گئی ہے کیوں کہ اس میں عصمت چغتائی نے ایک ایک جزئیات کا اس طرح تذکرہ کیا ہے کہ ایک گرافر کی طرح اس کانفرنس کی تصویر کا وہی رخ بیان کیا ہے جو ان کے سامنے آتا رہا ہے، ان کی حقیقت پسندی اور بے باکی نے اس رپورتاژ کی اہمیت وافادیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے مثال کے طور پر کیفی اعظمی کی شاعری کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''کیفی کو دیکھ کر شبہ ہوتا ہے کہ اسے ابھی گھڑے میں سے نکال کر کھڑا کر دیا ہے اور کوئی دم اونگھ کر گر جائے گا لیکن جب وہ اپنے اشعار پڑھتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا وجود ایک دبے ہوئے اسپرنگ کی طرح اچھل کر اوپر آرہا ہے''

عصمت چغتائی نے اپنے رپورتاژ میں ترقی پسندوں کی کانفرنس کی تفصیلات اپنی اور صفیہ کی کھٹ پٹ اور ایک دوسرے کی طبیعت کی عکاسی کے مکالمہ کو بہت ہی خوب اسلوب بیان میں پیش کی ہے مثلاً:

''کانفرنس کے پہلے اجلاس میں جاتے وقت میری اور صفیہ کی کسی نہایت بات پر کھٹ پٹ ہوگئی۔ اس کا کہنا تھا کہ میرے خمیر میں تیزابیت بہت ہے اور میں کہتی تھی کہ اسے بناتے وقت فرشتوں نے مٹی کو بجائے سادہ پانی کے شہد اور دودھ میں گوندھ ڈالا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو احمق سمجھتے ہوئے منٹو ہال پہنچ گئے۔ ہال کے ایک کونے میں پردے کا انتظام تھا۔ مردانے میں بھیڑ کم تھی مگر زنان خانے میں کافی گہما گہمی تھی''

عصمت چغتائی کے اس مشہور اور مایہ ناز رپورتاژ کا جب غائرانہ جائزہ لیا جاتا ہے اور رپورتاژ کے بقیہ اوصاف حمیدہ کو کھنگالا جاتا ہے تو قاری کو اس میں بہت کچھ کے ساتھ ساتھ متوسط طبقوں کی عورتوں کی نفسانیت، شعر و ادب میں جنسی میلانات، ترقی پسند نظریات اور ادب کی مقصدیت پر بھی بڑے خوبصورت انداز میں پوری بیان کی چاشنی کے ساتھ کافی مواد ملتا ہے۔ ایک جگہ لکھتی ہیں:

''کچھ لڑکیوں کی آنکھوں میں تو میں نے حد سے زیادہ بے صبری دیکھی۔ وہ اپنی موجودہ فضا سے اتنی گھبرا گئی ہیں کہ اسے ہر قیمت پر چھوڑنے کو تیار ہیں اور وہ اس پہلے شخص کے ساتھ نکل بھاگیں گی جو انہیں یہ سب کچھ دینے کا وعدہ کرلے۔

بتایئے نا- ہم کیا کریں ۔ انہوں نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا میں اگر آپ سے کہوں آپ پردہ چھوڑ دیجیے، تعلیم حاصل کیجیے، نوکریاں کیجیے، تعلیم بالغان میں حصہ لیجیے وغیرہ وغیرہ۔ تو مجھے معلوم ہے کہ اس میں کچھ نہیں دھرا ہے آپ پردے کی قید میں گرفتار ہیں ۔ آپ کی بہنیں جاہل ہیں' آپ کے ملک کے بچے بھوکے ہیں ، ننگے ہیں ، نوجوان بے روزگار ہیں، بیمار ہیں، یہ پردہ' یہ جہالت' یہ بھوک اور افلاس یہ سب ایک ہی پیڑ کے پھول پتے ہیں ۔ یہ ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں ۔ آپ اگر ان پھول پتوں کو ایک بار نوچ بھی ڈالیں تو ان میں پھر نئے پتے پھوٹ آئیں گے جن میں اس زیادہ گھناؤنے پھل پھول کھلیں گے ۔ اس لیے ہمیں جڑوں کے خلاف جنگ کرنی چاہیئے''۔

عصمت چغتائی کو بیان کا اور زبان کے استعمال کا جو ملکہ حاصل ہے اس نے ان کی رپورتاژ میں چار چاند لگا دئے ہیں اور جن لب ولہجہ کو انہوں نے اختیار کیا ہے وہ نہایت موزوں اور برمحل ہے وہ اس کانفرنس میں اپنی باری کا تذکرہ اور جم غفیر کا نقشہ بڑے اچھے انداز میں کھینچا ہے، مستزاد یہ کہ مائک بھی ناقابل استعمال ہے۔ اسے کچھ یوں ذکر کرتی ہیں:

''اب جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی ۔ خدا کی پناہ یہ بھیڑ ہے یا میری آنکھوں کو ایک ایک کے چار چار نظر آرہے ہیں ۔ جدھر دیکھو انسانوں کے چہرے ۔ آج زنان خانے کو گھسیٹ کر بہت دور کونے میں رکھدیا گیا تھا۔ مائیکروفون ٹھپ پڑا تھا مگر جاں نثار اختر منہ میں ٹھونسے دیتے تھے چونکہ وہ اس کا کرایہ دے چکے تھے ۔ لہذا بقول خان اپنا مال کھا ہی نہیں رہا تھا بلکہ دوسروں کو بھی کھلا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مائیکروفون گلا دبوچ لیتا ہے' ایک بار آواز کو نگل لیتا ہے اور پھر بڑھا کر اگلنے کے بجائے ڈکار جاتا ہے۔ پردے کے پیچھے سے بیویاں کھسر پھسر کر رہی تھیں ۔ خدا خدا کر کے پرچہ ختم ہوا''۔

غرض کہ عصمت چغتائی بنیادی طور پر افسانہ نگار اور ناول نویس ہیں لیکن انھوں نے ایک ہی باقاعدہ رپورتاژ لکھ کر اردو رپورتاژ کے ادبی سرمائے میں جو قابل قدر اضافہ کیا ہے اس سے اردو رپورتاژ نگاری میں ان کی ادبی اہمیت و افادیت مسلم ہوگئی ہے اور اردو رپورتاژ نگاری کی تاریخ میں بھی ان کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔

## اپنی زبان کی حفاظت کیجئے

عنوان دیکھ کر یہ نہ سمجھیں کہ میں نے منہ میں رہنے والی زبان کی حفاظت کے لئے کہا ہے ۔ اُس کی بھی حفاظت کی سخت ضرورت ہے' اس کے لئے پھر کبھی گفتگو ہوگی' اس وقت جس زبان کے بارے میں آپ کی توجہ مبذول کروا رہے ہیں وہ ہے اپنی پیاری نیاری ''اُردو زبان''۔ جو ہمارے لئے اب شاید صرف بول چال کی زبان رہ گئی ہے۔ ہمارے گھروں سے تو یہ بیچاری زبان نکالی جارہی ہے۔ ہمارے بچے اس زبان کو بھول رہے ہیں ۔ یہ خطرے کی گھنٹی بج چکی ہے۔ اس طرف دھیان دینا توجہ دینا اور اپنے بچوں کو سبق یاد دلانا میرا اور آپ کا کام ہے۔ انہیں بتائیں کہ اس زبان میں ہماری تہذیب' ثقافت ہے' یہ ہمارا سرمایہ ہے' ہمارے بزرگوں نے اس زبان کی ترقی کے لئے اپنا تن من دھن لگایا ہے۔

سفینہ عرفات فاطمہ
ریسرچ اسکالر ACSSEIP
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد۔32

گوشۂ خواتین

# دوہری ذمہ داریوں کا بوجھ
## برسرروزگار خواتین (Working Women) کے مسائل

کیا ایک گھر کا عورت کے بغیر تصور کیا جا سکتا ہے؟ ایک بے رونق مکان اور ایک بے نور آنگن اسی کے وجود کی روشنی سے ایک ''گھر'' بنتا ہے۔ وہ اپنی پوری توجہ، لگن اور چاہت سے ہر شئے کو سنوارتی ہے، اپنی ذات پر اپنے گھر اور اپنے عزیزوں کو فوقیت دیتی ہے۔ قدرت نے اسے سوز و گداز، نرمی اور محبت کے علاوہ کچھ ایسی صفات بخشی ہیں جو گھریلو زندگی سے متعلق اس کے فرائض کو خوش اسلوبی سے نبھانے کے لیے بے حد ضروری ہیں۔ وہ بہ یک وقت بیٹی، بہن، بیوی اور ماں کا کردار ادا کرتی ہے۔ اس کے قدرتی فرائض اور ذمہ داریوں میں کوئی خلل پورے خاندانی نظام کو درہم برہم کر سکتا ہے، یہی سبب ہے کہ اس پر معاشی جدوجہد اور ارکان خاندان کی کفالت کا زائد بوجھ نہیں ڈالا گیا۔ وہ گھر کی نگران ہے، اور خارجی امور مرد کے ذمہ ہیں۔ لیکن وہ اپنی خوشی سے ملازمت اختیار کرنا چاہے، تجارت یا کسی اور معاشی سرگرمی کا حصہ بننا چاہے تو اسے اس بات کی اجازت ہے۔ لیکن ایسی ملازمت یا معاشی سرگرمی جو اس کی گھریلو زندگی کو متاثر کر رہی ہو قطعی پسندیدہ نہیں۔

ایک ریسرچ اسکالر خاتون کا یہ خیال ہے کہ عورت کو ملازمت ہرگز نہیں کرنی چاہیے، مرد جتنا کمائے اسی میں گزارا کر لینا بہتر ہے۔ لیکن اس معاملے کے تئیں یوں قطعی اور بے لچک موقف اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ بیشتر خواتین کے لیے معاشی جدوجہد ایک ضرورت ہوتی ہے، اور ان کے لیے ایک مجبوری جن کا کوئی کفیل نہ ہو۔

یہ موجودہ عہد کا تقاضا بھی بنتا جا رہا ہے کہ عورت کوئی نہ کوئی معاشی سرگرمی یا ملازمت اختیار کرے۔ یوں وہ اپنے ناتواں شانوں پر داخلی اور خارجی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے پر مجبور ہے۔ اس کی توجہ کا مرکز اس کا گھر ہونا چاہیے، لیکن اب اس کی توجہ اندرونی اور بیرونی امور میں تقسیم ہو گئی ہے۔ معاشی دوڑ نے اسے نجی زندگی اور اس کی آسودگی سے محروم کر دیا ہے، زائد ذمہ داریوں کا دباؤ، بے سکونی، مسلسل کام کی تھکن نے اسے پژمردہ کر دیا ہے۔ متعدد مسائل کا بھنور ہے، اور اس سے نجات کی کوئی صورت نہیں۔

برسرروزگار خواتین کو جائے ملازمت پہنچنے کے لیے طویل سفر اور سفر کے دوران، غیر سلامتی اور عدم تحفظ کا

احساس' ملازمت کی جگہ پر ہراسانی اورصنفی امتیاز' اعلیٰ عہدیداروں کا بے جا دباؤ' مردوں کے مقابلے میں کم معاوضہ' حسب ضرورت مہارت اورصلاحیتوں کے باوجود بھی ترقی کا نہ ملنا' روزگار کی عدم ضمانت' طبی سہولتوں کا فقدان اور Maternity Leaves میں دشواری وغیرہ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

کام کرنے والی خواتین کو کئی گھریلو مسائل سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ان مسائل میں کمی بھی ہوسکتی ہے' اگرایک برسرروزگارعورت کا اس کے افرادخاندان ساتھ دیں۔ جب ایک خاتون' ارکان خاندان کی معاشی ضرورتوں کی تکمیل میں معاون بنی ہوئی ہے تو کیا اہل خانہ کا یہ فرض نہیں بنتا کہ اس کے مسائل کو سمجھیں؟ اس کی گھریلو ذمہ داریوں کی تکمیل میں اس کی اعانت کریں؟ شوہراوردیگرارکان خاندان کا عدم تعاون' بے جا تنقید اور غیرذمہ دارانہ رویہ اس کی مشکلات میں مزید اضافہ کرتا ہے۔

ASSOCHAM کی جانب سے 1000 پروفیشنل خواتین پر کیے گئے سروے کے مطابق 80 فیصد خاندان' بہوؤں سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ official work پر گھریلوامورکوترجیح دیں۔ان میں سے کئی جسمانی اورنفسیاتی طور پرسسرال والوں اورشوہر کی جانب سے تکلیف دہ سلوک کا سامنا کرتی ہیں لیکن کسی سے شکایت نہیں کرتیں۔

عورت معاشی طور پرخودمکتفی ہوتو عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ اب وہ نفقہ کی حقدارنہیں رہی۔حالاں کہ اس صورتحال میں بھی مردہی اس کی تمام جائزضرورتوں کی تکمیل کا ذمہ دارہوگا۔عورت اپنی تنخواہ اورآمدنی پر مکمل اختیاراورحق تصرف رکھتی ہے' لیکن حق تلفی اس کا مقدر ہے۔

UNDP کی رپورٹ کےمطابق خواتین دنیا کے 67 فیصدکام کی انجام دہی میں مشغول ہونے کے باوجود ہنوز سماجی اورمعاشی طور پرمحروم ہیں' دنیا کی کل آمدنی میں ان کا حصہ محض 10 فیصد ہے' اوروہ دنیا کے صرف ایک فیصد اثاثوں کی مالک ہیں۔

ملازمت پیشہ عورت کے لیے گھراوردفتر میں توازن ایک بڑا چیلنج ہے۔عام طور پراہل خانہ اس کی اس کشمکش کونہیں سمجھتے۔دوہری ذمہ داریوں کا بوجھ اور فیملی سپورٹ کا فقدان' ایسی خواتین کوذہنی دباؤ' بےخوابی' ڈپریشن' بے چینی (anxiety)' ناآسودگی اور مایوسی (frustration) کےحوالے کرتا ہے۔

مختلف سروے اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ملازمت اور گھر کی دوہری ذمہ داریاں خواتین کی صحت کوشدید متاثر کرتی ہیں۔

ڈاکٹرایل ایچ ہیرانندانی ہاسپٹل کی طرف سے کارپوریٹ سیکٹر میں برسرروزگار 25 سے 45 برس کی 300 سے زائد خواتین پر کیے گئے سروے کے مطابق 1/3 خواتین کوتولیدی (reproductive) اورہارمون سے متعلق مسائل کا سامنا تھا۔اس سروے سے

وابستہ گائناکولوجسٹ ڈاکٹر انیتا سونی کہتی ہیں: برسر روزگار عورتیں اپنی تیز رفتار طرزِ زندگی اور مسلسل بیٹھ کر کام کرنے کی وجہ سے ان مسائل میں مبتلا ہوتی ہیں۔ کمپیوٹر پر کام' کھانے پینے کی عادتوں پر مغرب کا اثر' ملازمت کا دباؤ' تھائیرائڈ' شوگر' فربہی اور دیگر طرزِ زندگی سے تعلق رکھنے والی بیماریوں میں اضافہ کرتا ہے۔

(http://www.dnaindia.com)

انڈین ایکسپریس مورخہ 6 مارچ 2014ء کی ایک رپورٹ کے مطابق دس شہروں میں 11 مختلف شعبوں کی 120 کمپنیوں میں ملازم 32 سے 58 برس کی 2,800 خواتین پر مشتمل سروے میں یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ 78 فیصد working women کو صحت کے مسائل کا سامنا ہے۔

(ASSOCHAM) کی جانب سے کیے گئے مذکورہ سروے میں کہا گیا ہے کہ نجی اور پیشہ ورانہ زندگی میں توازن کی کوشش اور اس سے پیدا ہونے والے دباؤ کے نتیجے میں ہندوستان میں ہر چار میں سے تین برسرروزگار خواتین طرزِ زندگی سے متعلق' کہنہ یا شدید بیماریوں کی شکار ہیں۔

یہ سروے دس شہروں دہلی' ممبئی' پونے' جئے پور' بنگلور' چنائی' احمد آباد' کولکتہ' لکھنو اور حیدرآباد میں کیا گیا۔ 42 فیصد برسرروزگار خواتین طرزِ زندگی سے متعلق عارضوں (lifestyle diseases) جیسے ہائپرٹینشن' فربہی' شوگر' ڈپریشن اور پیٹھ کے درد میں مبتلاء تھیں۔ جبکہ 22 فیصد خواتین کہنہ امراض سے متاثر پائی گئیں۔

عورت کی بیرون خانہ سرگرمی اور مسلسل مصروفیت اس کی ذاتی زندگی کو متاثر کرتی ہے۔ وہ دونوں محاذوں پر کامیاب ہو ایسا شاذونادر ہی ہوتا ہے۔ پروین شاکر نے کہا تھا:

پہلے میری ماں
میری مصروفیت سے
نالاں رہا کرتی تھی
اب یہی گلہ مجھ سے میرے بیٹے کو ہے
رزق کی اندھی دوڑ میں رشتے کتنے پیچھے رہ جاتے ہیں!

ooo

Pepsi Co کی ہندنژاد سی ای او اندرا نوئی (جن کا دنیا کی طاقتور ترین خواتین میں شمار ہوتا ہے) سے جب یہ دریافت کیا گیا کہ کیا وہ یہ محسوس کرتی ہیں کہ عورت سب کچھ حاصل کرسکتی ہے؟ انہوں نے اس بات کو تسلیم کیا کہ عورت کے لیے گھریلو زندگی اور کام میں توازن قائم رکھنا مشکل ہے۔ ان کا یہ احساس تھا کہ خواتین سب کچھ حاصل نہیں کرسکتیں' ہم ایسا دکھاوا کرتے ہیں کہ ہم نے سب کچھ پالیا ہے۔ اگر آپ میری بیٹیوں سے پوچھیں تو مجھے اس بات کا یقین نہیں ہے کہ وہ کہیں گی کہ میں ایک اچھی ماں ہوں' میں بارہا احساس جرم کی اذیت سے گزری ہوں کہ میں مصروفیت کے سبب اپنی بیٹیوں کے اسکول کی مختلف سرگرمیوں میں شامل نہیں ہوسکی۔ میرا یہ مشاہدہ رہا

ہے کہ ہمارے حیاتیاتی نظام ( biological clock) اور career clock کا ایک دوسرے سے ٹکراؤ اور تصادم ہوتا ہے۔ جب آپ کو ماں بننا چاہیے تب آپ کو کریئر بھی سنوارنا ہوتا ہے۔

اندرا نوئی کہتی ہیں: جب مجھے اس کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹرز میں شامل کیا گیا اور مجھے بتایا گیا کہ مجھے اس کمپنی کی پریسیڈنٹ بنایا جائے گا' میں جذبات سے مغلوب ہوگئی تھی لیکن اس خوش خبری پر میری ماں کے ردعمل نے مجھے مایوس کردیا تھا' ماں نے مجھ سے کہا تھا: تم چاہے پیپسی کمپنی کی صدر بن جاؤ لیکن جب تم اس گھر میں داخل ہوگی' تم ایک بیوی' بیٹی' بہو اور ماں ہوگی' لہٰذا اس 'تاج' کو تم باہر ہی رکھ آنا' گھر مت لے آنا۔ (انڈین ایکسپریس' 3 جولائی 2014ء)

عورت کو گھریلو زندگی اور اس سے وابستہ ذمہ داریوں کو ہی ترجیح دینی چاہیے۔ یا پھر وہ اندرون خانہ کسی معاشی سرگرمی اور روزگار سے جڑ جائے یا کوئی جز وقتی ملازمت اختیار کرے تاکہ اس پر زیادہ بوجھ نہ پڑے' اور وہ بچوں کی پرورش اور تربیت پر پوری توجہ دے سکے۔ اگر وہ کل وقتی ملازمت کرتی ہو تو پھر اس کے آس پاس ایسے لوگ ضرور ہوں جو اس کی غیر موجودگی میں اس کے گھر کا خیال رکھیں' جن کا اخلاقی تعاون اسے سنبھال سکے' جو اس کی ہمت اور حوصلہ کا باعث بنیں' جو اس کے نشیب و فراز کے ساتھی ہوں' جو اسے مسائل میں کبھی تنہا نہ چھوڑیں۔

☆☆☆

## مالک کے ہو جاؤ تو ساری کائنات تمہاری

ایک ریاست کے بادشاہ نے یہ اعلان کردیا کہ کل صبح جب میرے محل کا مرکزی دروازہ کھولا جائے' تب جس شخص نے بھی وہاں موجود جس چیز کو بھی ہاتھ لگا دیا وہ اُس کی ہو جائے گی۔ اس اعلان کو سن کر سب لوگ آپس میں بات چیت کرنے لگے کہ میں تو سب سے قیمتی چیز کو ہاتھ لگاؤں گا' کوئی کہنے لگا ''میں سونے کو ہاتھ لگاؤں گا' کچھ لوگ چاندی کو ہاتھ لگانے کی سوچنے لگے' کچھ قیمتی زیورات کے بارے میں' کچھ گھوڑوں کے بارے میں' کچھ لوگ ہاتھیوں کو ہاتھ لگانے کا ارادہ ظاہر کررہے تھے' کچھ لوگ دودھ دینے والی گائیوں کو ہاتھ لگانے کی بات کررہے تھے۔

جب صبح محل کا مرکزی دروازہ کھلا اور سب لوگ اپنی اپنی من پسند چیزوں کو ہاتھ لگانے کے لئے دوڑے' سب کو اس بات کی جلدی تھی کہ پہلے میں اپنی من پسند چیز کو ہاتھ لگاؤں تاکہ وہ میری ہو جائے۔ بادشاہ اپنی جگہ بیٹھا سب دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں اس بھیڑ میں سے ایک شخص بادشاہ کی طرف بڑھنے لگا اور قریب پہنچ کر اُس نے بادشاہ کو چھولیا۔ بادشاہ نے پوچھا کہ تو نے مجھے کیوں چھوا' تو اس شخص نے جواب دیا کہ یہ ساری چیزیں بادشاہ کی ہیں' اور بادشاہ میرا ہو چکا ہے۔ مجھے چیزوں کی کیا ضرورت؟ لوگ غلطی کررہے ہیں' چیزوں کے مالک کو کو چھوڑ کر چیزوں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔

ہمیں چاہیے کہ اس واقعہ سے سبق لیں اور چیزوں کے پیچھے بھاگنے کے بجائے چیزوں کے خالق (اللہ) کو اپنالیں اور اُسے اپنا بنالیں۔ سب کچھ بلکہ ساری کائنات ہماری ہو جائے گی۔

محمد خلیل، سائنسداں
سابق مُدیر رسالہ ''سائنس کی دنیا''

ایچ 51، ڈاکٹر اقبال لین
باٹلہ ہاؤز، جامعہ نگر، نیو دہلی 110 025

سائنس وٹکنالوجی

# ابوالقاسم الزّاہراوی طبی دنیا کا سب سے عظیم ستون

ابوالقاسم الزاہراوی کی پیدائش ۹۳۶ء میں ہوئی تھی لیکن ان کے کارہائے نمایاں ہمارے سامنے بیسویں صدی میں بیاں ہوتے ہیں۔ جب وہ پیدا ہوئے تو دنیا کے حالات وہ نہیں تھے جو آج ہوگئے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ان کی بہت سی سائنسی دریافتیں اس وقت عوام تک نہیں پہنچ سکیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت کی نئی دریافتوں کا سہرا دوسری سائنسی ماہرین کو جا پہنچا جبکہ وہ دریافتیں الزّاہراوی نے تقریباً پانچ صدی پہلے کر دکھائی تھی۔ ابوالقاسم الزّہرا کے مقام پر پیدا ہوئے اسی کی نسبت سے وہ الزہراوی مشہور ہوئے بعد میں یہ مقام بڑھ کر قرطبہ سے مل گیا۔ اس شہر کی علمی اور فنی مثال کہیں اور یورپ ہی نہیں ملتی۔ ان کے آباء واجداد کا نسلی رشتہ عرب سے تھا۔ ابتدائی تعلیمی زمانہ میں ہی ان کی دلچسپی طب میں تھی۔ اس طرح ابتدائی تعلیم کو حاصل کرنے کے بعد انہوں نے قرطبہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ ان کی دلچسپی تعلیمی وقت کے ساتھ ختم نہیں ہوئی انہیں زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی خواہش تھی اس طرح وہ تعلیمی مطالعے میں مشغول رہے۔ ان کی سب سے بڑی ذہنی مشکل یہ تھی کہ وہ جو کچھ بھی پڑھتے تھے اس میں ان کو اپنے ذہن میں پیدا سبھی سوالوں کے جواب نہیں ملتے تھے۔ منزل ابھی دور تھی انہیں اور تجربہ حاصل کرنا تھا۔ خلیفہ الناصر جو ہر ایک قابل قدر کرنے والے شخص تھے۔ اُنہوں نے الزّاہراوی کا تقرر شاہی اسپتال میں کر دیا۔ ان کے لئے یہ ایک سنہرا موقع تھا۔ اب وہ عملی طور پر طبی علم حاصل کر سکتے تھے۔ اس کا انہوں نے محنت سے پوری طرح فائدہ وتجزیہ حاصل کیا۔ جس کے نتیجے میں آج طبی دنیا میں ان کا شمار ایک اعلیٰ مُقام پر ہوتا ہے۔ اُنہوں نے اپنے گہرے مطالعے وتحقیق سے جو نتیجے حاصل کئے اور جو اصول واضح کئے وہ اہمیت کے حامل ہیں۔ اس زمانہ میں ہر قسم کا علاج بیماریوں کے لئے دواؤں سے کیا جاتا تھا۔ انہوں نے امراض کو دو قسموں میں تقسیم کیا۔ اول وہ امراض جن کا علاج دواؤں کے ذریعے ہوسکتا ہے اور دوئم وہ امراض جن کا علاج جرّاحی یعنی سرجری کے ذریعے کیا جانا چاہئے۔ اس زمانہ میں جرّاحی یا آپریشن کے طریقے سے علاج بالکل نئی نوعیت کا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ بعض جسمانی اعضاء کے خراب ہوجانے پر علاج صرف دواؤں تک محدود رکھنا مریض کی تکلیف کو بڑھانا ہوگا اس لئے بہتر ہوگا اس کے جسمانی اعضاء کو سرجری کے ذریعے علیحدہ کر دیا جائے۔ انہوں نے پورے جسمانی اعضاء کے امراض کا

تحقیقی جائزہ لینے کے بعد ان کا امراض کو تحریری طور پر بیان کیا ہے۔ الزاہراوی کے خیال میں اُس کا صحیح علاج آپریشن ہی ہے۔ اُن بیماریوں میں موتیا بند' ٹانسلس' غیر ضروری (فالتو) گوشت کا بڑھ جانا اِس کے علاوہ انہوں نے سر' دماغ' گردے اور آنتوں کی بیماریوں کو بھی اس گھیرے میں شامل کیا ہے۔ یہاں انہوں نے ٹوٹی ہوئی جسمانی ہڈّیوں کو کاٹ کر آپریشن سے جوڑنے اور دوسری جانب ٹوٹی ہوئی ہڈّی کو آپریشن کے ذریعے علیحدہ کرنے کے طریقے بھی تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ وہ مریض کو آپریشن سے قبل مناسب مقدار میں دوا کے ذریعے بیہوش کرنے کی تاکید کرتے ہیں جس سے مریض کو کم سے کم تکلیفوں کو برداشت کرنا ہو اور آپریشن بھی احتیاط واطمینان سے کیا جاسکے۔ الزاہراوی نے یہاں بُقراط کی طرح اس سلسلے میں ڈاکٹر کے فرائض کی وضاحت کی ہے اور آپریشن کے لئے اصول وطریقے مرتّب کر کے آپریشن کو پوری طرح ایک طبی فن کے طریقے سے تحریری انداز میں پیش کر کے اس کی وضاحت کی ہے۔ اس نے زخموں کے ٹانکوں کو سینے کے لئے کئی طرح کے دھاگوں پر تجزیوں کو کر کے بتایا ہے کہ کون سے قسم کے دھاگے مناسب اور بہترین ہیں۔ جراحی میں اس قدر سنجیدہ ہوئے پھر بھی وہ کینسر کا آپریشن کرنے کے سخت خلاف ہے۔ اِس سلسلے میں اس کا کہنا ہے کہ کینسر کے آپریشن سے کینسر کا زخم مزید خطرناک شکل اختیار کر لیتا ہے اس لئے اس بیماری کا علاج دوا سے ہی کرنا چاہئے۔

اِس میں شک نہیں کہ الزاہراوی کے ان جدید طبّی تحقیقی نظریوں اور تجویزوں نے طب کی دنیا میں ایک انقلاب شکل اختیار کر لی۔ اس کے کارہا کے نمایاں کو دیکھتے ہوئے مغربی اور مشرقی دونوں طبی حلقوں میں اسے جراحی کا موجد سمجھا جاتا ہے۔ اس نے صرف جراحی کی تجاویز ہی پیش نہیں کی ہیں بلکہ بیان کے دوران اپنی تحقیق کی روشنی میں بڑی تفصیل کے ساتھ مریضوں کی دیکھ بھال کرنے کی صحیح ومناسب طریقوں کو وضاحت کرتے ہوئے بیان کیا ہے۔ اُس زمانہ کی ایک اور مشکل یہ بھی تھی کہ جراحی کے لئے مناسب آلات موجود نہیں تھے اور ان کی دستیابی ایک اہم مسئلہ تھا۔

لیکن اُس زمانہ میں الزاہراوی نے ہمت نہیں چھوڑی اُس نے جراحات کے آلات کی تصویریں بنا کر قرطبہ کے تجربہ کار کاریگروں سے اپنی موجودگی میں آلات کو بنوائے تھے۔ ان آلات کی تیاری میں عمدہ قسم کے فولاد استعمال کئے جاتے تھے۔ اُن کی تیاری کے دوران اس کا خاص خیال رکھا جاتا تھا کہ ان پر ماہر طب کی گرفت مضبوط رہے اور ان آلات کی بناوٹ (زاویہ) ایسی کی گئی تھی کہ جن عضو پر اس کی ضرورت ہے وہ جراحی کے دوران ان آلوں کو آسانی کے ساتھ ان سے جراحی کی جاسکے۔ اس نے اس بات کا بھی خیال رکھا کہ جراحی کے دوران جسم کے نازک اور جسمانی اندرونی حصوں کے لئے استعمال کئے جانے والے آلات بناتے وقت اِن ذوپیش سہولیات کے لئے خاص طور پر خیال رکھا گیا تاکہ کوئی مشکل نہ پیدا ہو۔ ایک اندازے مطابق اس نے تقریباً دوسو جراحی کے آلات کی

تیارشدہ تصویریں چھوڑیں ہیں ۔ان جراحی آلات کا موجد الزاہراوی خود ہی ہے اوران میں سے کئی آلات اب تک اپنی اسی شکل جیسے وہ بنائے گئے تھے استعمال ہورہے ہیں ۔ اس نے جراحی کے لئے مختلف قسم کی چمٹیاں' چھریاں اور چاقو اور قینچیاں' نشتر وغیرہ جو بنائے وہ جراحی کے دوران ضرورت کے مطابق اُس کا استعمال کرتے تھے۔

الزاہراوی کا ذہن نہایت غور فکر سے آراستہ تھا وہ اختراعی ذہن رکھتے تھے دوسری جانب ان میں مشاہدے کی بلا کی قوت تھی ۔وہ مریض کے ماحول اوراس کے لئے دی جانے والی غذا کو بڑی اہمیت دیتے تھے ۔ان کے خیال میں مریض کے لئے صاف ماحول اُسی تک محدود نہیں ہے بلکہ عام صحت مندلوگوں کے لئے بھی صاف ماحول ضروری ہے۔ وہ تیمارداری اورمریض کے رشتہ کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ اِسی لئے کئی نفسیاتی مسائل کے مدنظر انہوں نے مریض کے لئے نفسیاتی دوائیں بھی ایجادکی تھیں ۔وہ مریضوں کو ٹرنکولائز ر یعنی مسکن دوائیں دیتے تھے جو ان کو تناؤ سے نجات دلاتی تھیں ۔وہ عالمی سطح پر پہلے طبی ماہر تھے جس نے کٹی ہوئی شریانوں کا خون بند کرنے کے لئے انہیں باندھنے کا طریقہ ابتدائی طور پر بتایا ۔ انہوں نے ہڈیوں کو جوڑنے کے بعد پلاسٹر چڑھانے اور پھُنسی' پھوڑوں کے علاج کے طریقے کی ابتدا کی اوراسے طبی دنیا میں عام کرنے کی کوشش کی ۔اسی طرح آنکھ کے آپریشن اورکان کے پردے کے بارے میں بہت سی اہم معلومات انہوں نے تحقیق سے معلوم کیں جو آج بھی عام ہے۔ یہ انہیں کا زمانہ ہے ۔زچگی کے دوران والچر پوزیشن کہلاتی ہے وہ انہیں کی دریافت ہے ۔وہ طبی دنیا کے پہلے ماہر ہیں جس نے ہیموفیلیا کے ایک مریض کا مشاہدکر کے تفصیلی وضاحت کی ہے۔

یہ تعجب کا مقام ہے کہ ان کی دلچسپی طب کے علاوہ ریاضت' فلکیات' کیمیا' طبیعات یہاں تک کہ ان کو نفسیات اورشاعری میں بھی دخل تھا ۔وہ طب کے کسی ایک شعبے کا انتخاب کرنے کے بعد اپنی کل توجہ اُسی ایک کے لئے وقف کرنے کے حق میں رہی ہے ۔کیونکہ ایک وقت میں بہت سے شعبوں میں الجھے رہنے سے نتیجہ انتشار میں سامنے آتا ہے ان کی واحد کتاب کو طب کی تاریخ میں جو مقام حاصل ہے وہ بہت کم کتابوں میں ملا ہے ۔یہ طبی کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے اورایک طرح سے ایسے اِن سائیکلو پیڈیا کا درجہ حاصل ہے ۔انہوں نے اس کتاب کو پچاس سال کی عمر میں مکمل کرلیا تھا ۔یہ کتاب ان کے ساری طبی تجزیوں ومشاہدے کا نچوڑ ہے ۔اس کتاب میں ادویہ سازی کا بھی ذکر ملتا ہے ۔ ایک اطلاع کے مطابق اس کتاب کو پانچ صدیوں تک علمِ طب کی ایک اہم سب سے مستند کتاب حیثیت حاصل رہی ہے۔

اس طرح یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ عالمی سطح پر طبی میدان میں ابوالقاسم الزاہراوی کی خدمات اس قدر گراں اورقدیمی ہیں کہ ان کی ایجادوں اوراختراع کو دیکھتے ہوئے طلب کا عظیم ستون کہنا کسی حقیقت سے کم نہ ہوگا اوران کی خدمات کی ہمیشہ یادکیا جائے۔

☆☆☆

اقبال مجیداللہ
69' یوسف کالونی
پربھنی 431401 (مہاراشٹرا)

انشائیہ

# جو بات تیری تصویر میں ہے تجھ میں نہیں

اپنی تصویر کھنچوانے کے الگ الگ انداز ہوتے ہیں تصویر کشی بلاشبہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک ایسا عمل ہے جو فرد کے قد وخال کے ساتھ اُس کی سوچ کو بھی اجاگر کرتا ہے جیسے کچھ لوگ اپنی تصویر اُن کے فطری انداز جس میں وہ عام طور پر نظر آتے ہیں وہ بغیر کسی بناوٹ کے اپنی تصویر میں نظر آنا پسند کرتے ہیں اور یہ انداز بڑی حد تک فطری لگتا ہے اور وہ دیکھنے والوں کو بھی لبھاتا ہے اس سادگی میں ہی اُس کا حُسن چھپا رہتا ہے تصویر کشی زندگی کے مختلف شعبوں سے گہرا تعلق رکھتی ہے اب تصویر کشی زندگی کے مختلف شعبوں کے علاوہ ادب میں بھی ایک اہم کردار ادا کر رہی ہیں اور ان شعبوں میں اس کا عمل و دخل کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا ہے۔ ادب کا تصویر سے کیا رشتہ ہے اس تعلق کو ہم سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ اس حقیقت سے ہم بخوبی واقفیت رکھتے ہیکہ موجودہ دور میں ادب کا منظر نامہ تیزی سے بدل رہا ہے تخلیق کاروں اور قارئین کے رویے ایسے نہیں رہے جو چالیس پچاس برس پہلے نظر آتے تھے آج کے قلمکار اپنی تخلیقات میں کوئی اصلاح یا ترمیم ضروری نہیں سمجھتے ہیں بلکہ وہ اُسے مکمل تصور کرتے ہیں۔ پہلے قلمکار اپنی تخلیقات کے ساتھ اپنی تصویر رسائل کو بھجوانا ضروری نہیں سمجھتے تھے البتہ رسائل کی جانب سے کسی سالانہ یا خصوصی شمارے میں قلمکاروں کی تصاویر شائع ہوا کرتی تھیں اب یہ رجحان بدل چکا ہے اب تحریر کے ساتھ تصویر بھی بھجوانا از حد ضروری ہے اور اس بات کا بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ تصویر ایک ایسے انداز سے لی جائے جن میں قلمکار کے نقوش زیادہ واضح اور اُس کی عمر کا صحیح اندازہ نہ ہو سکے۔ بلکہ قلمکار اپنی جوانی کی تصویر ہی شائع کرنے پر اصرار کرتے ہیں یہ بات کسی صنف کے حد تک محدود نہیں بلکہ دونوں ہی اس کا شکار ہیں بلکہ صنف نازک میں یہ احساس کچھ زیادہ ہی نظر آتا ہے وہ اپنے فن سے زیادہ اپنے حُسن کا خیال رکھتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ وہ قارئین کے خوابوں میں سما جائے اس تعلق سے ایک واقعہ ہماری نظروں سے گذرا وہ یوں کہ ایک ماہنامہ کے مدیر کو ایک شاعرہ کی جانب سے کچھ غزلیں اس ماہنامے میں شائع کرنے کے لئے وصول ہوئیں اس غزل کے ساتھ اُس شاعرہ کی تصویر بھی شامل تھی مدیر ماہنامہ کو یہ تصویر دیکھ کر انھیں لگا کہ یہ تصویر مشہور اداکارہ مینا کشی شیشا دری کی لگی۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب اداکارہ مینا کشی شیشا دری فلموں میں کافی عروج پر تھی مدیر نے سوچا کسی وجہ یا سہواً اُن

کی تصویر کے بجائے اداکارہ کی تصویر روانہ کردی گئی ہوانھوں نے سوچا کہ انھیں اس بارے میں دریافت کیا جائے چنانچہ مدیر نے نہایت مودبانہ شاعرہ سے التماس کیا کہ ادارہ کو اُن کی غزلوں کے ساتھ ساتھ تصویر بھی ملی ہے مگر تصویر دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ اداکارہ میناکشی شیشادری کی تصویر روانہ کی گئی ہے ۔ہم آپ سے ادباً پوچھنا چاہتے ہیں کہ تصویر آپ کی ہے یا اداکارہ کی اُس شاعرہ نے رسالے کے مدیر کو فی الفور جواب دیا کہ وہ تحریر اور تصویر دونوں ہی میری ہے اب اگر میناکشی شیشادری کی صورت مجھ سے اگر ملتی جلتی ہوں تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔اس رسالے کے مدیر نے شاعرہ سے معذرت چاہی اور بڑے اہتمام کے ساتھ تحریر اور تصویر اپنے رسالے میں شائع کی اور اس طرح سے یہ معاملہ خیر خوبی سے سلجھ گیا۔ اب تحریر کے ساتھ تصویر بھجوانا لازم وملزوم بن گیا ہے اور تصویر کے بغیر تحریر جیسے نامکمل نظر آتی ہے اب تخلیق کار اپنے رسائل میں اپنی تخلیق کے بجائے اپنی تصویر کو تلاش کرتے ہیں کہ وہ بہتر طریقے سے شائع ہوئی یا نہیں۔اپنی تصویر کے ساتھ پرانی بلکہ بڑی حد تک جوانی کی تصویر کو شائع کروانے کے اس نفسیاتی پہلو کو ہم سمجھنے سے قاصر ہیں ہم یہ بات ایک عمر رسیدہ ادیب دوست جو اپنی جوانی کی تصویر شائع کروانے میں اُن سے دریافت کیا تو انھوں نے نہایت سنجیدگی سے کہا کہ میری گذری ہوئی تصویر دیکھ کر میرے اندر لطیف احساسات دوبارہ زندہ ہوجاتے ہیں میں اپنے گذرے عہد میں کچھ دیر کے لئے ہی سہی لوٹ جاتا ہوں اور یہی لمحات میرے لئے بڑے قیمتی ہوتے ہیں اور میں انہیں اپنے اندر جذب کرنا چاہتا ہوں اور یہ تصویر دیکھ کر میں اپنی زندگی میں تازگی بھر لیتا ہوں۔

تحریر کے ساتھ تصویر کو دیکھ کر عمر کا صحیح اندازہ لگانے میں کبھی کبھی عجیب صورت حال سے بھی دو چار کردیتی ہے۔عمر کے تعلق سے ہم اندازہ قائم کرتے ہیں وہ اکثر درست ثابت نہیں ہوتے ابھی حال ہی میں ہمارے شہر میں منعقدہ ادبی کانفرنس میں ایک ایسے ہی واقعہ سے گزرنا پڑا وہ یوں ہوا کہ اس کانفرنس کے لئے ایک معروف ادیب کو مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا اُن سے شرکت کے معاملہ میں کافی دنوں سے خط وکتابت و گفتگو رہی اُن سے ملی تصویر جسے کانفرنس کے دعوت نامہ میں چھپوانا تھا اُسے دیکھ کر اندازہ ہوا کہ وہ موصوف اپنے پچاس برس سے زیادہ نہیں لگے ۔کانفرنس کی تیاریاں زوروں پر شروع ہوگئی تاکہ اُسے ہر طرح سے کامیاب بنایا جاسکے۔ کانفرنس کے مقررہ دن کمیٹی کے ارکان اپنے مہمان خصوصی کا استقبال اور انہیں لینے کے لئے اسٹیشن پر پہنچے مگر تلاش کے باوجود وہ نہ صرف نظر آئے اور نہ ہی اُن کی شناخت کا کوئی ہمشکل ۔اراکین عجیب تذبذب میں پڑ گئے کانفرنس میں اُن کی شرکت بے حد ضروری تھی۔ادھر جلسہ گاہ میں سامعین اُن کے آنے کے بے چینی سے منتظر تھے وہ لوگ مایوس ہوکر ابھی لوٹ ہی رہے تھے کہ اُن کی نظر ایک ایسے شخص پر پڑ گئی جس کی عمر ۸۰ برس سے کم نظر نہیں آئی مگر وہ اپنے حلیہ کی وجہ سے وہ ادیب ہی لگ رہے

تھے اُن میں وہ تمام خصوصیات نظر آ رہی تھی جو عام طور پر ادیبوں ،شعراء میں دکھائی دیتی ہے اُنھیں دیکھ کر ادیب ہونے کا شبہ ہوا انھوں نے سوچا کیوں نہ اُس شخص سے با ت چیت کی جائے ہوسکتا ہے کہ وہ ہمیں اُس شخصیت کے بارے میں معلومات فراہم کردیں یا خدا نہ کریں یہی وہ شخص ہو جس کا ہم انتظار کررہے ہیں ۔اُن سے نہایت مودبانہ دریافت کرنے پر اُس شخص نے بڑی انکساری سے کہا کہ میں ہی نہ چیز ہوں جو اُس کانفرنس میں شرکت کے لئے آیا ہوں اور یہاں پہنچنے کے بعد میں تلاش ہی کررہا تھا کہ اس کانفرنس کے لوگ انھیں لینے ضروری آئینگے ۔ اتنا سُن کر منتظمین میں اچھی طرح دیکھنے کے بعد اطمینان کی سانس لی ۔

اب تصویر کشی کے انداز یکسر بدل گئے ہیں اب نئی تکنیک کے ذریعے ستر برس کے عمر رسیدہ چالیس برس کا دکھانا اب فوٹو گرافی کے لئے مشکل ہی نہیں بلکہ بہتر نقوش کے ساتھ دکھایا جاسکتا ہے ۔اسی نوعیت کی ایک تصویر کے حوالے سے ہمیں یاد آیا کہ ہمارے ایک افسانہ نگار دوست سے پوچھا کہ کافی عرصے سے کوئی تخلیق نظر سے نہیں گزری انھوں نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا کہ میرا تازہ افسانہ تو تیار ہے بلکہ میں نے اُسے ٹائپ بھی کرواچکا ہو اب میں صرف اپنی نئی تصویر کا انتظار کررہا ہوں جو ابھی تک نہیں ملی ہے چوں کہ میرے فوٹو گرافر نے اپنے اسٹوڈیو میں میری تصویر کو کچھ ایسی شکل دے رہے ہیں جس سے میرے فنکارانہ اظہار اور چہرے کے نقوش زیادہ واضح ہوجائیں یہ تصویر مکمل ہوتے ہی میں افسانہ اشاعت کے لئے روانہ کردونگا۔انھوں نے مزید کہا کہ میں اس بات کا عادی ہو چکا ہوں کہ تصویر کے بغیر میری تحریر کچھ نامکمل نظر آتی ہے ۔دیکھا آپ نے تصویر کے اس رجحان نے قلمکاروں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے اور یہی حال رہا تو قارئین بھی تحریر کے بجائے تصویر دیکھ کر ہی تخلیق کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کریں گے اور اُن کی تصویر ہی فن کا تعین کریں گے ۔اب تصویر دیکھ کر یہ کہنا دشوار ہے کہ وہ شخص ایسا ہی ہوگا جس کی تصویر ہم دیکھ دے رہے ہیں ۔ یہ معاملہ بعض وقت ادیبوں ،شاعروں اور خاص طور پر شاعرات کے تعلق سے یہ زیادہ امکانات نظر آتے ہیں کہ خوبصورت تحریر کے ساتھ خوبصورت تصویر دیکھ کر بھی نوجوان اپنی قلمی دوستی کو عشق کے حدود میں داخل ہوجاتے ہیں مگر جب یہ حقیقت سامنے آتی ہے تو اُس کے کافی دشواریاں بھی پیدا ہوجاتی ہے ۔اس لئے بہتر ہوگا کہ تخلیق کار اپنی تازہ تخلیق کے ساتھ تازہ تصویر بھی بجھوائیں تاکہ ان باتوں سے حتی امکان بچایا جاسکیں ۔

ہم نے پہلے ہی اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ کچھ لوگ اپنے فطری انداز میں ہی نظر آنا پسند کرتے ہیں برخلاف اس کے کچھ لوگ جنھیں خالق نے خوبصورت یا کم از کم قبول صورت سے محروم رکھا ہے وہ اپنے عیوب چھپانے کے لئے مختلف سوانگ رچاتے ہیں ۔اس صورت میں اور بالخصوص شادی بیاہ یا رشتے طئے کرنے میں دھوکہ کھا جانے کے واضح امکانات نظر آتے ہیں ۔اس صورت

حال کو ہمارے ایک قریبی شاعر کی روداد تقویت پہنچاتی ہے ہمارے یہ شاعر جو قد میں بمشکل چار فٹ ، منحنی سی شخصیت کے مالک اکثر مشاعروں میں ہنسی کا موزوں بن جاتے تھے جیسے وہ مشاعرے میں اپنی غزل پڑھنے کے لئے کھڑے ہوتے تھے مگر کوتاں قد ہونے کی وجہ سے وہ بیٹھے ہوئے ہی نظر آتے تھے بس کیا تھا سامعین میں کچھ منچلے زوردار آواز لگاتے ہوئے اس بات کا مطالبہ کرتے کہ کھڑے ہوکر سنائیں تو پورے ہال میں بلند ہوتے ہوئے قہقہوں پر قابو پانا ناظم مشاعرہ کے لئے کافی دشوار ہو جاتا ہے ۔ اُن کی دشواریاں نا صرف مشاعروں کی حد تک نہ تھی بلکہ زندگی کے عام معاملات میں بھی انھیں ان سے دوچار ہونا پڑتا تھا ۔ اُن کی شادی کے سلسلے میں انھوں نے خاص طور پر اپنی تصویر جس میں وہ مکمل سوٹ میں سیاہ چشمہ لگائے نہایت ہی باوقار شخصیت نظر آتے ۔ تصویر میں اُن کے قد کے اس عیب کو مکمل طور پر چھپا دیا گیا تھا چنانچہ اُن کی یہ تصویر دیکھ کر خواہش مند رشتے اس بات کو آگے بڑھانے کی کوشش بھی کرتے تھے مگر جیسے ہی اُن کی نظر پڑتی اُن کی کوتاہ قد ساری کاوشوں پر پانی پھیر دیتا اور بات یہیں رک جاتی اُن کے قریبی رشتہ دار بڑی کوششوں کے باوجود مایوس ہو چکے تھے بلا آخر انھوں نے ایک ترکیب نکالی کے اُن کے قریبی قدآور دراز قد نوجوان کو اس کے لئے رضا مند کیا گیا کہ نوشاہ کے طور پر ہی اُن کا دکھایا جائے اس طرح دلہن کے رشتے اس نوجوان کو دیکھنے کے بعد اپنا اظہار رضا مندی کیا اور شادی کی تیاریاں شروع ہوگئی حقیقی نوشاہ کو اس طرح سے سجانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی کے اُن کا یہ قد ظاہر نہ ہو جائیں مگر عین وقت اُن کے کسی اور رشتہ دار نے ہی انھیں واقف کروادیا کہ اُن کے ساتھ کوئی دوسرا کھیل کھیلا جارہا ہے ۔ بس کیا تھا کہ لڑکی کے رشتہ داروں نے خوب دھوم کی اور نوشاہ کو اپنے اصلی روپ میں ظاہر کرنے پر اصرار کیا اور اس طرح سے ہمارے شاعر دوست دوست کی ازدواجی زندگی منسلک ہوتے ہوتے رہ گئی ۔ تصویر کہنے کو ایک سادہ سی چیز ہے مگر اپنے اندر کیسی حشر سامانیوں کو لئے ہوئے ہیں ۔

دورِ حاضر میں عکس کشی ایک سیدھا سادھا عمل نہ ہوکر اب فرد کی نفسیات کا ایک پیچیدہ مسئلہ بن گیا ہے اور شاید ہمارے شعراء اکرام نے اس پیچیدگی کو ذہن میں بہت پہلے رکھتے ہوئے اس کو سمجھنے اور سمجھانے کی جو تاویلات پیش کی ہے اُس کے کئی پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے جیسے ادا، شرارت، اقرار، انکار وغیرہ وغیرہ اس کے باوجود بھی اس کو مکمل طور پر سمجھنے میں بھی قاصر رہے اور اُن کی عکاسی مکمل نہ تھیں اور اسی لئے انھوں نے کہا ''جو بات تجھ میں ہے تیری تصویر میں نہیں'' جو بالکل درست تھا مگر اب اس بات کو تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ پہلے تصویر کے بارے میں کہا جاتا تھا مگر اب ہم ''جو بات تصویر میں ہے وہ تجھ میں نہیں کہنے میں حق بہ جانب ہے اور تصویر کے بارے میں جو حقائق سامنے آرہے ہیں اُس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ۔

☆☆☆

انور ہادی
لکچرر ہسٹری شعبہ اردو
ایس کے آر ایڈن ایس کے آر گورنمنٹ کالج فار وومن
کڈپہ (آندھراپردیش)

معاشرت

# انسانی اقدار۔ضرورت اوراہمیت

دورقدیم سے عصرحاضرتک انسانی اقدار پر بحث و مباحثے عروج پر ہیں اور آگے بھی ہوتے رہیں گے ۔انسانی اقدار جب کبھی مجروح ہوئے یاانہیں پامال کرنے کی کوشش کی گئی وہاں پر انقلاب بپا ہوئے ۔پہلی جنگ عظیم دوسری جنگ عظیم یوروپین ممالک میں آپسی رقابتیں' سب انسانی اقدار کی پامالی کی وجہ سے ہی وجود میں آئے ۔چلئے انسانی اقدار کی موجودصورت حال پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے اس کی اہمیت اورضرورت کوبھی جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔غالب نے کیا خوب کہاہے:

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

ہرعہد میں لالچ ،طمع ،خودغرضی،دھوکہ بازی ،حق کو شکنی کوطرہ ودستار بنانے والے افراد کی فراوانی رہی ہے ،مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ آج کے دورمیں یہ ساری چیزیں یک جٹ ہوکر انسان کے گلے کا طوق اور پاؤں کی زنجیر کا کام انجام دے رہے ہیں ۔دولت کمانے کی لالچ نے انسان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے ۔خودغرضی اورمفادپرستی نے رشتوں کی مضبوطی چادرکوتارتار کردیاہے۔اورانسان وحشیانہ کوائف کواپنے اندرسمونے کی لاشعوری کوشش میں لگا ہواہے اسے اس بات کاقطعی علم نہیں کہ وہ انسانی اقدارکو بالائے طاق رکھ کرکس طوفانی سمت اپنی منزل کی تلاش میں نکل پڑاہے

عہد حاضر میں کوئی اور بات اس سے زیادہ قوی اوراہمیت کی حامل نہیں ہے کہ جس پر گفتگوکرسکیں' آج ساری دنیا ترقی اورآزادی کی دوڑ میں لگی ہوئی ہے ۔اورخاص کر مغربی تہذیب نے اس آزادی کی مہم کا بیڑا اٹھالیاہے ۔جس کا نتیجہ آزادی کے نام پرایک ایسی مشینی تہذیب کے زیراثر اہم آگئے ہیں' جوبدترین اورسقیم صورت حال پیدا کررہی ہے۔

بہ ظاہرانسانی اقداراورحقوق کے پردے میں پاس داری تو ہورہی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس تہذیب نے ایک انسان کوانسان ہونے کے احساس سے عاری کررکھا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ آج والدین کے قدرومنزلت گھٹ گئی ہے ۔اساتذہ کا احترام بھائی بہنوں کے اقدارعنقاہوتے نظر آرہے ہیں ۔ دوستوں سے ،رشتہ داروں سے ہمدردی میں نفاق اورمفادپرستی کی بوآرہی ہے ۔مظلوم ظلم کا شکارہے ،عیش پرست عیاشی میں مگن،بےسہاراسہارے کی تلاش میں تھکے ہارے جارہے ہیں۔ غرض عہد حاضر کا انسان اپنے واجبی اقداروں سے محروم ہوکر

کوسوں دور نکل گیا ہے۔

شوہر بیوی کے اور بیوی شوہر کے حقوق میں کوتاہی کررہے ۔اور یہی کوتاہی اقدار کے تنزیلی کی وجہ سے بنتی جارہی ہے ۔ماں باپ بچوں کے اور بچے والدین کے تئیں قدر میں یا حقوق میں کوتاہی کررہے ہیں ۔عہد حاضر نے انسانی اقدار کی جگہ مال ومنال دے دی ہے۔عہدہ ومنسب داری کو پروان چڑھایا ہے ۔بے فیض سیاستدانوں کی گندی سیاست نے ان اقداروں کی پامالی میں کوئی کسر باقی نہ رکھی ۔ زرزمین کا لالچ پر تول رہا ہے ۔عہد حاضر متقاضی ہے انسانی اقدار کے پاسداری کی ۔اگر ایک شخص کامیاب وکامران ہونا چاہتا ہے تو وہ ایسا راستہ اختیار کرتا ہے جس میں دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہو، کیوں کہ آج کل ایسے راستوں کے راہی سماج میں اونچی شان Position کے مالک بن بیٹھے ہیں اوران کی قدرومنزلت عروج پر ہے ۔جب کہ اس کے برعکس دوسروں سے ہمدردی ،خستہ حالتوں میں امداد کا تصور ،لوگوں میں کبھی تھا ۔یہی وجہ تھی کہ ایک شخص انفرادی طور پر زندگی گزارنے والا جس کا کوئی اپنا نہیں ہوتا تھا وہ بھی رشتوں کی ڈور سے بندھا ہوتا تھا۔ پڑیسیوں کی محبت سے مالا مال ہوا کرتا تھا۔اس کو کبھی یہ احساس غالب نہ کرسکتا تھا کہ وہ معاشرے میں اکیلا وتنہا ہے ۔ایک دوسرے کے دکھ سکھ کو مل بانٹ لیا کرتے تھے ۔جس کی وجہ سے کبھی کسی قسم کے پرائیت کا احساس نہیں ہوتا تھا ۔لیکن یہ تمام جذبات واحساسات آج جیسے معدوم ہو چکے ہیں۔

**ضرورت واہمیت:** آج انسان کو سب سے زیادہ ضرورت اور تلاش ہے تو ایک انسان کی ۔آج انسان کو ضرورت ہے اس کے جائز مراعات کی ۔آج ضرورت ہے اولاد کو والدین کی محبت کی اور خصوصی توجہ کی ۔گھڑی مل بیٹھنے اور دو میٹھے بول کی۔ آج ضرورت ہے رشتہ داروں کی ۔رشتہ داروں کے ساتھ سکوکِ حسنہ کی ۔آج ضرورت ہے خاندانوں میں احساس حب کی ۔ضرورت ہے میاں بیوی کے مابین الفت کی ،صبر کی ۔جب تک اس خلا کو پر کرنے کی جاں فشان کوشش نہیں ہوگی تب تک انسان انسانیت کے حس سے محروم رہے گا۔

زندگی کی بھاگ دوڑ میں انسان اتنا مصنوعی اور مشنری تعلقات میں مبتلا ہوگیا ہے کہ اسے فرصت ہی نہیں ۔ نتیجہ عالم انسانیت اورانسانی قدرو قیمت خطرے کا شکار۔ 77 ویں انڈین پبلک اسکول کے افتتاحی اجلاس میں ہماری ریاست ،ریاست آندھراپردیش کے گورنر۔ای۔ایس۔ایل۔ نرسمہن نے حاضرین سے مخاطب ہوکر کہا کہ ''ہمارے بچوں کے اندر انسانی اقدار کا احساس پیدا کرنا اشد ضروری ہے ۔ اور یہ امر بہت ہی اہم اور توجہ کا طالب ہے ۔ہم اپنے بچوں میں اچھے اخلاق کو پروان چڑھائیں''۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اہل مکہ یا پھر یوں کہوں تو بہتر ہوگا کفار مکہ نے مسلمانوں کو بے گھر کرکے انہیں عدم تحفظ اور ہجرت کا شکار کردیا تھا ۔ایسے میں مسلمانوں نے ابی سینہ (حبشہ ) کے حکمران جو عیسائی تھا اس کے ہاں پناہ مانگی اوراس نے پناہ دے بھی دی ۔ایک طرف عیسائی دوسری طرف مسلمان دھرم الگ عقیدہ الگ ۔پھر بھی ایک دوسرے کی امداد یہی انسانی اقدار کی دلیل ہے ۔ جہاں

محبت کا فقدان ہے وہاں قدر کی گنجائش بھی ممکن نہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے بے شمار واقعات ہیں جس کو ساری دنیا سرخم تسلیم کرتی ہے۔اسلام نے انسانوں کے متعلق بہت سارے اصول وضوابط بتایا ہے۔جو رہتی دنیا تک کے لئے اور عالم انسانیت کے لئے مشعل راہ کا کام سرانجام دے رہے ہیں۔جب مدینہ منورہ سے سرکار دوعالم ﷺ مکہ کی طرف پیش قدمی کئے اور مکہ کی فتح ونصرت آپ کے قدوم چومنے لگی تو ایسی صورت حال میں کفار مکہ پریشان حال سوچ رہے تھے کہ آخر ہمارے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ہم نے تو کوئی کسر باقی اٹھا نہ رکھی حضور کو ستانے میں۔لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کے ساتھ صلہ رحمی کا معاملہ کیا اور عام معافی دے دی۔جسے سن کر کفار مکہ پر سکتہ چھا گیا تھا۔نبی کریم ﷺ نے انسانی اقدار کو حقوق العباد کے درجہ تک پہنچا دیا۔

آج ضرورت ہے ہمیں ایسے اقدار کی اور اقدار شناس آنکھ کی دل ودماغ کی۔جب تک ایک انسان دوسرے انسان کی قدر نہیں کرے گا تب تک سماج میں کوئی سدھار کی ممکنہ کوشش بے سود یا رائیگاں ثابت ہوگی۔آج ساری دنیا لاعلمی سے علم کی طرف دوڑ پڑی ہے۔ناخواندگی سے خواندگی کی طرف اپنا سفینہ موڑ رہی ہے مگر افسوس انسانی اقدار کے فقدان کا طوفان اس سفینہ حیات کو نہ تو کنارہ دے رہا ہے اور نہ آرام دہ سفر۔اب بھی وقت ہے اپنی نسلوں کو اس مرض مہلک سے دور کرنے کا۔ذہنوں میں انسانی محبتوں کی خوشبو کو پھیلانے کا۔ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے بچوں کو صحیح تعلیم دیں' ان کے دلوں کو بے حس ہونے سے بچا کر ان میں انسانی قدر کی رشتہ داروں کے رشتوں کی پہچان کروائیں۔انہیں اس ڈگر پر ہرگز نہ چلنے دیں جس ڈگر پر چل کر ہمارے طور وطریقے ہمارے اخلاق، ہمارے عادات واطوار، خود کی قدر وپہچان ریزہ ریزہ ہوکر رہ جائے۔

ہم جس معاشرہ میں سانس لے رہے ہیں اس معاشرے کے کمزور اور محروم طبقوں کی دلجوئی کا ہمیں خیال ہی نہیں ہماری کامیابی اور نامی کا انحصار بھی ہماری قدر پر مبنی ہے۔ہمارا معاشرہ اور ہم بہت ہی برے حالات کا سامنا کر رہے ہیں۔احسان کا بدلہ احسان سے دنیا چھوڑ کر ہم ایک دوسرے کے جذبات واحساسات کا استحصال کرنے میں مگن ہیں۔ہم اس بات کو بھول بیٹھے ہیں کہ جیسا ہم سلوک روا رکھیں گے بالکل ایسے ہی سلوک کا کبھی ہم بھی شکار ہو سکتے ہیں۔اگر کسی انسان کے برے وقت میں ہم تنگ دست ہوجاتے ہیں تو ایسی ہی تنگ دستی کی چادر ہمارے سروں پر بھی آسکتی ہے۔

الغرض میں اتنا کہنا چاہوں گا کہ ہمیں اپنی ذمہ داریوں سے اور فرائض سے حقوق سے اور خاص کر حقوق العباد سے منہ موڑنا نہیں چاہئے۔انسانی اقداروں اور اس کی اہمیت کا ہمیں پاس ولحاظ رکھنا بے حد ضروری ہے اور اس درس کو اپنی نسلوں تک ایمانداری پہنچانا ہی ہماری دانائی ہے۔خودغرضی اور خود پرستی کے مرض مہلک سے معاشرے کو بچانا ہی ہمارا عین مقصد ہونا چاہئے۔

☆☆☆

عابدہ محبوب
ریڈ ہلز، حیدرآباد

طنز و مزاح

# ہماری جو شامت آئی

مثل مشہور ہے کہ جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے۔ ہماری موت تو نہیں مگر شامت ضرور آئی تھی کہ ہم نے اسکول کا رخ کیا اور ٹیچر بن بیٹھے یا بنا دیئے گئے۔

یہ حادثہ ان دنوں پیش آیا جب ہم B.A. مکمل کر کے گھر پر چین کی بنسری بجا رہے تھے۔ اسکول کا زمانہ یاد ماضی میں ''ماضی بعید'' کالج کا زمانہ ''ماضی قریب'' بن چکا تھا۔ گھر پر ڈھیر ساری کتابیں اور رسالے آتے تھے۔ سارا وقت انہیں پڑھنے میں گزر جاتا تھا۔ کبھی کچھ وقت کہانیاں، مضامین اور ڈرامے لکھنے میں گزر جاتا، کبھی شوق چراتا تو سلوائی، کڑھوائی یا باغبانی کرتے یا پھر اپنی من پسند کوئی ڈش بنانے کی کوشش کرتے۔ کبھی سہیلیوں کے گھر گپ شب کرنے چلے جاتے، کبھی کوئی اچھی فلم لگتی تو دیکھنے چلے جاتے۔ کبھی پکنک کا مزہ لیتے جو اس زمانے میں قلعہ گولکنڈہ، گنڈی پیٹ یا Zoo تک محدود تھی۔ کبھی کوئی ادبی مشاعرہ ہوتا تو سننے چلے جاتے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ ہم اپنی پسندیدہ اور من مانی زندگی میں مگن تھے۔

ہماری یہ من مانی ہمارے والدین سے زیادہ ہمارے ایک شفیق پڑوسی چچا جان کی نظر میں کھٹکنے لگی۔ وہ ہم جیسے من موجی کو راہ راست پر لانے کا مصمم ارادہ کر کے ہمارے پاس آئے اور بولے،

''بیٹی تم کسی اسکول میں ٹیچر کا Job کیوں نہیں کر لیتیں؟ آخر تعلیم حاصل کرنے کا کچھ تو مقصد ہونا چاہئے۔ اپنی صلاحیتوں اور اوقات ضائع کر رہی ہو!''۔

چودہ برس کے ''بن باس'' کے بعد ہمیں یہ آزادی نصیب ہوئی بھی۔ اور اب ہم اس آزادی کو ہرگز کھونا نہیں چاہتے تھے۔ پہلے تو ہم نے ٹال مٹول کیا۔ پھر ادباً یہ کہہ کر معذرت بھی چاہ لی کہ ہم Trained نہیں ہیں۔ مگر چچا جان بھی ہار ماننے والے کب تھے؟ بولے:

''تم اس کی فکر مت کرو۔ وہ ایک خانگی Aided اسکول ہے۔ وہاں چند ٹیچرز Untrained بھی ہیں۔ ایک سال بعد خود اسکول والے Training کو بھیج دیتے ہیں؟

''مگر چچا جان''۔۔۔۔ ہم نے کچھ کہنا چاہا مگر چچا جان نے ہماری بات کاٹ دی اور بولے:

''اگر مگر کچھ نہیں ! ذرا سوچو' ٹیچر کا پیشہ سب پیشوں میں اعلیٰ اور معزز ہے۔ اگر ٹیچر نہ ہوتے تو یہ ڈاکٹر' انجینئر' سائنس داں اور ایڈوکیٹ کہاں ہوتے۔

چچا جان کی بات سچ تو تھی مگر ہم نے ''من آنم کہ من دانم'' کی روشنی میں دبی زبان سے انکار ہی کر دیا۔ مگر چچا جان کے ترکش میں نہ جانے کتنے تیر تھے کہ وہ ایک کے بعد ایک چلاتے رہے' وہ بولتے رہے ہم سنتے رہے۔ انہوں نے غریبی ہٹاؤ' جہالت مٹاؤ اور دیش کو سورگ بناؤ 'جیسے موضوعات پر ایسے موثر انداز میں ہمارے کان بھرے کہ مجبوراً ہم نے ہتھیار ڈال دیئے۔ کچھ تو جب الوطنی کا جوش اور کچھ تعمیر ملت کا شوق دونوں نے ہمیں اس خوش فہمی میں مبتلا کر دیا کہ ہم بے خطر ''قوم کے معمار'' بننے کا اعزاز حاصل کر سکتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ عقل کو محو تماشا چھوڑ کر ہم آتش چچا جان میں کود پڑے۔

ہمیں وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب ہم پہلی بار کلاس میں داخل ہوئے تھے۔ طلباء ہماری آمد کو ''خوش آمدید' 'کہنے کے موڈ میں بالکل نہ تھے۔ ہماری زندگی کا یہ پہلا موقع تھا کہ ہم ''تن تنہا'' اتنے بڑے مجمع (غالباً چالیس طلباء) کے سامنے کھڑے تھے۔ سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کریں۔ اپنی گھبراہٹ کو چھپانے کے لئے ہم نے چہرے پر مسکراہٹ لالی۔ جواباً طلباء بھی مسکرا دیتے۔ ہماری مسکراہٹ تو طلباء سے لائن ملانے کی ایک کڑی تھی۔ طلباء کی جواباً مسکراہٹ کا مطلب ہمیں آہستہ آہستہ بعد میں سمجھ میں آنے لگا۔

دن رفتہ رفتہ گزرتے گئے۔ ہم طلبا سے اور طلباء ہم سے مانوس ہوتے گئے۔ ہمیں ہائی اسکول کی کلاسس کو اردو پڑھانے کا ٹائم ٹیبل دیا گیا تھا۔ کچھ دنوں بعد ہم نے محسوس کیا کہ طلباء ہمیں کسی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ہماری کلاس میں شور مچانا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ ایک دن تنگ آکر ہم نے کہا ''شور مت کیجئے''۔

کسی کی آواز آئی ''تو پھر کیا کریں؟''

''کیا کریں؟ پڑھائی کریں اور خاموش رہیں' باتیں نہ کریں۔ اسی طرح شور ہوتا رہا تو کلاس میں خاموشی کیسے رہے گی؟''

دوسرے کونے سے آواز آئی ''جب کلاس کو چھٹی دیدی جائے''۔

کلاس کی حاضری کے وقت ہم نے نوٹ کیا کہ اکثر طلباء اپنے غیر حاضر دوست کی بھی حاضری آواز بدل کر ڈالوا دیتے تھے۔ ہم نے اس حرکت کے لئے منع کیا تو بولے۔

''لوگ تو دوست کے لئے جان دیدیتے ہیں ٹیچر کیا ہم اتنا بھی نہ کریں؟''

درس و تدریس کے دوران طلباء نے ہمارے وہ سارے خواب چکنا چور کر دیئے جن کے سہارے ہم انہیں ''فخر ملت بنانا چاہتے تھے۔ صغیر یعنی KG سے لے کر تک اردو ہمارا ذریعے تعلیم تھا۔ اپنی ہی مادری زبان اردو میں طلباء نے ہمارے چھکے چھڑا دیئے۔

سب سے پہلے تو ہمیں یہ دیکھ کر دلی تکلیف ہوئی کہ طلباء کی اکثریت اردو میں اپنا نام تک نہیں لکھ سکتی تھی۔

دوسری بات طلباء کی تحریر Hand Writing اتنی بگڑی ہوئی تھی کہ اس کو دیکھ کر ہمیں ایسا لگتا تھا کہ مختلف قسم کے حشرات کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہو۔ لکھنے کا انداز تو بالکل Chineese تھا یعنی اوپر سے نیچے کی طرف۔ ایک تو تحریر خراب اس پر ہر لفظ کے ساتھ غیر ضروری نقطے لگا دیتے تھے۔ ہم نے کئی بار ہدایت کی کہ وہ تمام نقطے مارجن میں رکھدیں ہم ضرورت کے لحاظ سے لگا کر پڑھ لیں گے مگر طلباء نے ہماری ہدایت پر عمل کرنا تو سیکھا ہی نہ تھا۔

املا میں غلطیاں اتنی تھیں جتنی کہ آسمان پر تارے۔ املا کی ذرا سی غلطی سے عبارت کا کیا حشر ہوتا تھا ملاحظہ کیجئے۔ جیسے نظم ''برسات'' کے خلاصہ کا ایک جملہ ہے۔ بارش کے دنوں میں کسان کاندھے پر ''ہل'' رکھ کر خوشی خوشی کھیت کا رخ کرتے ہیں۔ ایک طالب علم نے لکھا '' بارش کے دنوں میں کسان کاندھے پر ''بیل'' رکھ کر خوشی خوشی کھیت کا رخ کرتے ہیں''۔

کبھی بدحواسی میں تحریر کا مفہوم بدل کر رکھ دیتے تھے۔ جیسے مجاز کی نظم ''خانہ بدوش'' کا خلاصہ ایک طالب علم نے اس طرح شروع کیا۔ ''خانہ بدوش وہ لوگ ہوتے ہیں جن کا اپنا کوئی ذاتی گھر نہیں ہوتا۔ وہ زمین کے نیچے اور آسمان کے اوپر اپنی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں''۔

محاوروں کا جملوں میں استعمال بھی طلباء اپنے ڈھنگ سے کرتے تھے۔ ایک بار کلاس میں ہم نے محاورہ ''دم دبا کر بھاگنا'' کو جملے میں استعمال کرنے کو کہا۔ ایک دبلے پتلے طالب علم نے اٹھ کر جوش وخروش سے فرمایا۔

''شیر مجھ کو دیکھتے ہی دُم دبا کر بھاگ گیا''۔

دوسرے طالب نے ''چہرہ فق ہوجانا'' کا جملہ اس طرح بنایا۔

ہمارے اسکول کا S S C کا رزلٹ Zero آنے پر ہمارے ٹیچرز اور صدر صاحبہ کا چہرہ فق ہو گیا''۔

کلاس میں سوالات کے جوابات بھی وہ اپنے انداز سے دیتے تھے۔ ''غزل'' کے بارے میں معلومات دینے کے بعد ہم نے سوال کیا۔

مطلع کس کو کہتے ہیں؟ جواب ملا ''مطلع وہ ہے جہاں پر ہم کو عید کا چاند دکھائی دیتا ہے''۔

ہم نے مضمون نویسی کی کلاس میں پوچھا

''تندرستی ہزار نعمت ہے'' کیوں کہا جاتا ہے؟

ایک صحت مند تندرست طالب علم نے ناراضگی کے لہجے میں کہا۔

''تندرستی ہزار نعمت ہے'' کہنا بالکل غلط ہے کیونکہ تندرست بچے اسکول نہ جانے کا کوئی بہانہ ہی نہیں کر سکتے!''۔

ایک بار جماعتوں کے درمیان ہم نے جنگ اور امن کے فائدے اور نقصانات پر تقریری مقابلہ رکھا۔ بحیثیت انچارج حصہ لینے والی پارٹیوں کو تقریر کے لئے تیار کیا۔ امن کے حامی ایک طالب علم نے اپنی تقریر یوں شروع کی۔

زندگی کتنی ہی شاندار سہی
موت کا مگر جواب نہیں

ooo

جنگ کی تائید کرنے والی پارٹی نے کہا ''جنگ کا فائدہ بچوں کو ہوتا ہے کہ ان دنوں اسکول بند ہو جاتے ہیں''۔

اس پر امن کی حامی پارٹی نے پر جوش انداز میں طنز کیا' ہمارے فاضل دوستوں کو چھٹیوں کی فکر پڑی ہے۔ انسانی جانوں کی نہیں ! میرے دوست ! جنگ وہ بری بلا ہے جس میں ماؤں کے بیٹے مرجاتے ہیں۔ ان کی گود اجڑ اجاتی ہے ! معصوم بچے یتیم ہو جاتے ہیں اور بیواؤں کا سہاگ لٹ جاتا ہے۔ اور ہماری ساری محنت پر پانی پھر گیا۔

اسی طرح تحریری مقابلے کے لئے ہم نے تعلیمی تفریح پر مضمون لکھنے کا سوال دیا۔ ایک طالب علم کا مضمون ملاحظہ کریں۔

''ہم ہر روز تعلیمی تفریح کے لئے اسکول آتے ہیں۔ مگر ہر سال ہم کو اسکول سے تعلیمی تفریح کے لئے لے جاتے ہیں۔ اس سال ہم کو صبح سات بجے قلعہ گولکنڈہ لے گئے۔ وہاں سے ہم آگرہ گئے اور تاج محل دیکھا۔ پھر ایلورہ اور اجنتا دیکھتے ہوئے ناگرجنا ساگر گئے۔ رات بارہ بجے کے قریب اسکول واپس آئے۔

خطوط نویسی بھی ملاحظہ فرمایئے امتحانی پرچے میں سوال دیا گیا تھا کہ ''اپنی سالگرہ کی تقریب میں اپنے دوست کو خط لکھ کر مدعو کریں''۔ ایک طالب علم نے خطابت' سلام اور خیر خیریت کے بعد لکھا۔ آج شام میری سالگرہ ہے۔ یہ خط میں امتحان ہال میں بیٹھ کر جلدی میں لکھ رہا ہوں۔ آپ ضرور میری سالگرہ میں آئیں اور ہاں اپنی بہن کو بھی ضرور ساتھ لائیں۔ آپ لوگ آرہے ہیں کہ نہیں جلد از جلد خط کے ذریعہ اطلاع دیں''۔

اشعار کا مطلب بھی طلباء ایسا لکھتے ہیں کہ ہماری عقل چکرا جاتی تھی۔ شاہد صدیقی مرحوم کا ایک خوبصورت شعر ہے:

تمام عمر تیرا انتظار کرلیں گے
مگر یہ رنج رہے گا کہ زندگی کم ہے

ooo

ایک طالب علم نے اس کی تشریح یوں کی ''شاعر اپنی محبوبہ سے کہتا ہے کہ ہم تمہارا انتظار کر سکتے ہیں مگر رنج یہ ہے کہ اس کے لئے ہم تمام عمر تو زندہ نہیں رہ سکتے''۔

ایک دن ہم کلاس لے رہے تھے کہ ایک طالب علم نے آکر کہا۔ ''ٹیچر ! ہیڈ مسٹرس آپ کو ارجنٹ کام سے بلا رہی ہیں۔ ہم دوڑے دوڑے گئے''۔ ہیڈ مسٹرس مسکراتی ہوئیں بولیں ''آپ کو پتہ ہے آج یکم اپریل ہے''۔

ہم غصے کو ضبط کرتے ہوئے کلاس کو واپس آئے کہ سب کو سزا دیں گے۔ مگر جیسے ہی کلاس کے بورڈ پر نظر پڑی' وہاں کسی نے لکھ دیا تھا۔

''اپریل فول بنا دیا۔ تو ٹیچر کو غصہ آیا''۔

اب غصہ تھوکنے کے سوا ء کوئی چارہ نہ تھا۔ مصنوعی مسکراہٹ چہرہ پر لانی ہی پڑی۔ یہ نہیں بلکہ ایک دن

تو ہمارا ٹفن ہی غائب ہو گیا۔ دوسرے دن ملا۔ کھول کر دیکھا تو اس میں ایک کاغذ پر لکھا ہوا تھا۔ ٹیچر! آپ کا سالن بیحد مزیدار تھا۔ ذرا زیادہ لایا کیجئے نا!۔ ایک اور دن ہمارے راتب کے رکشا والے کو یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ ٹیچر کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اس لئے جلدی چلی گئیں۔ بے چارہ رکشا والا پریشان ہو کر ہمارے گھر آیا۔ حقیقت کا پتہ چلا تو غصے سے کہا ''بی بی جی آپ اپنے ساتھ ہمیشہ ایک چھڑی رکھا کیجئے اور ان کی خوب مرمت کیجئے' خود درست ہو جائیں گے''۔ ہم ٹھیرے گاندھی جی کے پیرو! اہنسا کے پجاری' تشدد کا راستہ کیسے اختیار کرتے!۔ رکشے والے کے مشورہ کا شکریہ ادا کر کے رہ گئے۔

مزید شامت یوں آئی کہ SSC کے سالانہ امتحان کے لئے ہمارا اسکول سنٹر بنایا گیا۔ ہمیں بھی امتحان ہال میں نگرانی کا کام سونپا گیا تھا۔ امتحان ہال' امتحال ہال کم اور کلاس روم زیادہ لگتا تھا۔ کیونکہ امیدوار امتحان ہال میں کتب ساتھ لا کر اپنی اسٹڈی میں مصروف تھے۔ جب پرچہ شروع ہوا تو وہ سیٹ پر ایسے بے چین' بے چین تھے جیسے کوئی کانٹوں پر بیٹھا ہو۔ امیدوار محنت سے زیادہ نقل نویسی کے بھروسے امتحان دینے آ گئے تھے۔ قسمت ساتھ دے تو پانچوں انگلیاں گھی میں اور اگر رنگے ہاتھوں پکڑے جائیں تو چوری اور سینہ زوری پر اتر آتے۔

''یہ نقل کا پرچہ میرا نہیں ہے! کسی نے ادھر پھینک دیا ہے''۔ یا پھر غلطی سے لا لیا تھا مگر لکھا تھوڑی ہے''۔

ہم یہ دیکھ کر بھی حیران رہ گئے کہ اپریل کا مہینہ ہے اور امتحان میں شریک امیدوار ''ولیمہ کا دولہا'' بنے امتحان ہال میں تشریف لا رہے تھے۔ سینئر ساتھی اساتذہ سے پتہ چلا کہ نہ صرف اس تھری پیس سوٹ کے اندر بلکہ پاتابے اور شوز کے اندر بھی نقل نویسی کا لبالب اسٹاک لے آتے ہیں۔ اب کس کی مجال تھی کہ جامہ تلاشی لے اور بلڈنگ کے باہر اپنی شامت کو دعوت دے۔ ہمارے طالب علمی کے زمانے میں طلباء کی یونین کے کچھ مقاصد ہوا کرتے تھے۔ آج مقاصد کی جگہ مطالبات نے لے لی ہے۔ چند مطالبات ملاحظہ فرمائیں:

☆ طلباء والدین کی زبردستی سے اسکول آ جاتے ہیں اس جور و جفا کے بجائے انہیں اپنی مرضی سے اسکول آنے جانے کے لئے چھوڑ دیا جائے تو یہ طلباء نوازی ہوگی۔

☆ لیٹ آنے پر کلاس آوٹ یا ڈانٹ ڈپٹ نہ کی جائے ورنہ طلباء احتجاجاً گھر لوٹ جانے کے لئے حق بجانب ہوں گے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ گھر جانے کے بجائے کسی مارننگ شو کو چلے جائیں اور اس طرح طلباء کو بگاڑنے کی ذمہ داری بھی اسکول پر ہی رہے گی۔ طلبا کو ہفتے میں پانچ دن کلر ڈریس اور صرف ایک دن یونیفارم پہننے کی اجازت دی جائے تاکہ نئے ڈیزائن کے کپڑے پہننے کا موقع مل سکے۔

☆ طلباء کو کلاس میں باتیں کرنے اور شور مچانے کی رعایت دی جائے۔

☆ طلباء کو سبق یاد کرنے اور ہوم ورک کرنے کا پابند نہ کیا جائے ۔ آج کا سبق کل سننے کی پالیسی اختیار کی جائے ۔

☆ طلباء کو اسکول کے پلے گراونڈ میں بلا روک ٹوک محمد اظہر الدین اور سچن ٹنڈولکر بننے کا موقع دیا جائے ۔ یوں بھی تازہ ہوا صحت کے لئے سودوا کی ایک دوا ہے ۔

☆ اگر طلباء کی سالانہ حاضری اسی (۸۰) فیصد نہ آئے تو کلاس ٹیچر کا فرض بنتا ہے کہ وہ Ink Remover کی مدد سے حاضری کے متعلقہ رجسٹر میں اس کی فوراً تکمیل کرے ۔

☆ اگر کسی مضمون کے ٹیچر کا تبادلہ ہو جائے یا وہ پنشن پر سبکدوش ہو جائے تو اس کی جگہ نئے ٹیچر کے تقرر کی کوشش سے سخت پرہیز کیا جائے ۔

☆ امتحان ہال میں نقل نویسی Cheating کی آنکھ مچولی ہونی چاہئے ۔ ورنہ سختی کرنے سے طلباء میں ذہنی تناؤ دماغی امراض پیدا ہو سکتے ہیں اور اس کا پہلا نشانہ (یا حملہ) نگران کار اساتذہ ہو سکتے ہیں ۔

☆ اگر طلباء نے نقل نویسی کے کاغذات کہیں چھپا کر رکھ لئے ہیں تو ان کی جامہ تلاشی نہ لی جائے ۔ کیونکہ پہلے تو اس سے گدگدی ہوتی ہے دوسرے امتحان ہال میں عزت کا دیوالیہ نکل جاتا ہے ۔ تیسرے نقل نویسی کی تیاری کی محنت اکارت ہو جاتی ہے ۔

☆ اگر کسی طالب علم کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا جائے تو صرف وارننگ دے کر آگے کی کاروائی ردی دان میں ڈال دی جائے ۔ ورنہ سنگین نتائج کی ذمہ داری معہ خرچہ امتحان کے سنٹر اور اس سے متعلقہ افراد پر ہوگی ۔

☆ آخری اہم مطالبہ یہ کہ طلباء برادری کو دی جانے والی تمام سزاؤں کو ختم کرنے کے لئے فوری اقدامات کئے جائیں ۔

☆ ان مطالبات کی روشنی میں ہم اندازکر سکتے ہیں کہ وہ دن دور نہیں جب طلباء برادری ہر پندرہ سالہ طالب علم کو SSC کا سرٹیفکیٹ دینے کے لئے دھرنا دے گی ۔ آج کی مہذب دنیا میں خطرناک مجرموں کو بھی مہذب سزائیں دے کر سدھارنے کی کوشش کی جارہی ہے ۔ قید تنہائی کو بھی ایک مہذب سزاء سمجھا جاتا ہے ۔ مستقبل میں ہمارے معزز جج صاحبان شاید اس طرح اپنے فیصلے سنائیں گے کہ:

اس خطرناک مجرم کو دو سال کے لئے اُردو میڈیم اسکول پر ٹیچر بنا کر بھیجنے کی سزا دی جاتی ہے!۔

اس وقت مجرم فریاد کرے گا ۔ می لارڈ! مجھ پر رحم کیجئے بہتر ہے آپ مجھے پھانسی دیدیں!۔

قصہ مختصر ہم نے اس اسکول پر ایک سال قید بامشقت گزاری ۔ بی ایڈ میں داخلہ ملنے پر استعفیٰ دیدیا ۔ اس کے بعد بھی ہم اٹھائیس سال تک شعبہ تعلیمات سے ہی وابستہ رہے مگر ہر وقت یہ مشہور شعر ہمارے دہن میں محفوظ رہا۔

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

☆☆☆

تحریر: رابندر ناتھ ٹیگور
مترجم: ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی

افسانہ

# کابلی والا

میری پانچ سالہ بیٹی منی (Mini) کافی باتونی تھی۔ جب وہ ڈیڑھ سال کی تھی تب اس نے بات کرنا شروع کیا تھا اس وقت سے اب تک اس کی زندگی کا شائد ہی کوئی موقع ہو جو اس نے چپ رہنے کے سلسلے میں گنوایا ہو۔ وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ بولتی رہتی تھی۔ اس کی ماں اکثر اسے چپ کرانے کے لئے ڈانٹتی رہتی تھی، پر میں اسے کچھ نہیں بولتا تھا۔ میری بیٹی خاموش رہے یہ مجھ سے بھی برداشت نہیں ہوتا تھا اور یہ غیر معمولی بات تھی کہ میری ہنس مکھ باتونی بٹیا چپ رہے اس لئے میں اور وہ اکثر باتیں کرتے رہتے تھے اور اکثر ہماری باتیں دلچسپ ہوا کرتی تھیں۔

ایک دن صبح جب میں اپنے ناول کا ستر ہواں باب لکھنا شروع کر رہا تھا منی میرے کمرے میں آئی اور کہنا لگی ''پتا جی اپنے سنتری کو بات کرنے کا ڈھنگ بھی نہیں ہے وہ نہیں جانتا کہ کو اکیسے کہا جائے وہ ان پڑھ گنوار لگتا ہے''۔ اس سے پہلے کہ میں اسے مختلف زبانوں کا فرق بتاتا اس نے ایک اور موضوع چھیڑ دیا۔ کہنے لگی ''پتا جی بھولا کہہ رہا تھا کہ جب ایک ہاتھی اپنی سونڈ میں پانی کھینچ لیتا ہے اور اسے اونچائی سے پھینکتا ہے تو اسے بارش کہتے ہیں۔ واہ کیا کہنے بھولا کے دن بھر سوچے سمجھے بغیر کچھ بھی کہتا رہتا ہے۔'' اس بارے میں میرا خیال جانے بغیر منی نے ایک اور مشکل سوال کر دیا ''پتا جی ممی آپ کی کیا ہوتی ہیں''؟ میں دل میں سوچتا رہا کہ منی کو اس سوال کا کیا جواب دوں۔ تاہم میں نے اس کے مشکل سوال کا جواب دینے کے بجائے کہہ دیا کہ ''تم جاؤ اور بھولا کے ساتھ کھیلو مجھے کچھ کام ہے''۔ لیکن وہ میرے پیروں پر چڑھ گئی اور اپنی ہتھیلیاں میری ہتھیلیوں پر مارتے ہوئے اپنے اسکول کی ایک نرسری نظم گانے لگی۔ جب کہ میرے ناول کے سترھویں باب میں پرتاپ سنگھ کنچن مالا کے ساتھ ایک اندھیری رات میں جیل کی دیوار پھلانگتے ہوئے ساتھ بہنے والی ندی میں کودنے والا تھا۔ درمیان میں اچانک منی نے اپنا کھیل بند کر دیا اور کھڑکی سے جھانک کر پکارنے لگی ''کابلی والا، او! کابلی والا''۔

گلی سے ایک دراز افغان میوہ فروش گزر رہا تھا۔ اس کے سر پر شملہ بندھا ہوا تھا۔ اس کا لباس معمولی تھا۔ گلے میں ایک تھیلا تھا اور ہاتھ میں خشک انگور کے کچھ ڈبے لئے وہ گلی سے آہستہ آہستہ گذر رہا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ کابلی والا کو دیکھتے ہی منی کے ذہن میں کیا خیال آیا تھا لیکن وہ مسلسل اسے آواز دئے جا رہی تھی۔ منی کی آواز سے میرے ناول کا تسلسل ٹوٹنے لگا تھا۔

لیکن منی کی آواز سن کر جیسے ہی کابلی والا اس کے گھر کی طرف پلٹا منی فوری باہر کی طرف دوڑ پڑی۔ کابلی والا گھر کے آنگن سے ہوتا ہوا دروازے کے قریب آیا اور سلام ساب جی کہنے لگا۔ میں سوچنے لگا کہ میرے ناول کے کردار پرتاپ سنگھ اور کنچن مالا اپنے انجام کو پہونچنے والے ہیں اور ادھر یہ کابلی والا آ گیا۔ مجھے اچھا نہیں لگا کہ میں کابلی والا سے کچھ خریداری نہ کروں۔ میں نے اس سے کچھ چیزیں خریدیں اس سے افغانستان کے حالات معلوم کئے خاص طور سے سرحد کے بارے میں روس اور برطانیہ کی پالیسی اور افغانستان کے صدر عبدالرحمٰن کے بارے میں پوچھتا رہا اور وہ اپنی معلومات کی حد تک مجھے اپنے ملک کے حالات سناتا رہا۔ جب وہ جانے لگا تو اس نے مجھ سے دریافت کیا ''ساب آپ کی چھوٹی بیٹی کہاں ہے''؟ دراصل منی کابلی والا کے زبردست ڈیل ڈول سے کچھ ڈر سی گئی تھی کیونکہ بنگال میں اس طرح کے خدوخال کے لوگ نہیں ہوا کرتے تھے۔ میں نے منی کو آواز دی۔ وہ ڈرتی ڈرتی باہر آئی اور میرے پیچھے چھپ گئی۔ وہ کابلی والا اور اس کے بستے کو تعجب سے دیکھنے لگی تھی۔ اس نے اپنے بستے سے کچھ کشمش اور اخروٹ نکالے اور منی کو دئے۔ لیکن منی نے اسے لینے سے انکار کر دیا اور وہ مسلسل مجھ سے چمٹی رہی۔ یہ کابلی والا کی مجھ سے اور منی سے پہلی ملاقات تھی۔ کچھ دن بعد جب میں ایک ضروری کام سے گھر سے باہر نکل رہا تھا میں نے دیکھا کہ گھر کے باہر چبوترے پر منی کابلی والا سے مسلسل باتیں کر رہی تھی۔ اور کابلی والا ٹوٹی پھوٹی بنگالی میں منی کو اس کے سوالوں کے جواب دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ پانچ سال کی زندگی میں پتا جی کے بعد کابلی والا وہ دوسرا شخص تھا جو منی کی باتوں کو سنتا رہتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ منی کی اوڑھنی سے بہت سے اخروٹ اور بادام بندھے ہوئے تھے۔ یہ دیکھنے کے بعد میں نے کابلی والا سے دریافت کیا کہ وہ منی کو یہ سب کیوں دے رہا ہے۔ آئندہ سے ایسا نہ کرنا۔ میں نے جیب سے اٹھنی نکالی اور اسے دے دیا۔ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کابلی والا نے پیسے لے لئے اور اپنے جیب میں ڈال لئے۔ جب میں کام سے فارغ ہو کر گھر واپس آیا تو دیکھا کہ گھر میں اٹھنی کے تعلق سے کافی بحث و مباحثہ ہو رہا ہے کہ جب کہ منی کی ماں اس سے دریافت کر رہی تھی کہ اسے یہ اٹھنی کہاں ملی۔ کس نے دی؟۔ منی نے معصومیت سے جواب دیا کہ کابلی والا نے اسے یہ اٹھنی دی ہے۔ ماں نے غصہ کرتے ہوئے کہا ''تم نے اس سے یہ پیسے کیوں لئے''؟ منی نے معصومیت سے جواب دیا ''میں نے نہیں پوچھے تھے کابلی والا نے اپنی طرف سے خود دئے''۔ میں نے بیچ بچاؤ کیا اور منی کو چہل قدمی کے لئے باہر لے گیا۔ مجھے باتوں سے پتہ چلا کہ کابلی والا اور منی کی یہ دوسری ملاقات نہیں تھی بلکہ کابلی والا روز آتا تھا اور منی کو روز کچھ نہ کچھ خشک میوے دے جاتا تھا اس طرح اس نے بچپن کے جذبات سے بھرا منی کا معصوم دل جیت لیا تھا۔

کابلی والا کا نام رحمت تھا۔ منی ناک میں سے آواز نکال کر رحمت پکارتی اور جب بھی وہ کابلی والا کو دیکھتی اس سے پوچھتی کابلی والا او کابلی والا تمہارے تھیلے میں کیا ہے وہ مسکراتے ہوئے جواب دیتا کشمش انگور اور بہت کچھ۔ اور وہ دونوں ہنسنے لگتے۔ ایک چھوٹی بچی اور ایک عمر رسیدہ انسان کو آپس میں بچوں جیسا ہنستے دیکھ کر مجھے بے حد مسرت ہوتی اور میں یہ منظر دیکھ کر

جذباتی ہوجاتا۔دوسری بات جو دونوں کے درمیان اکثر ہوتی وہ یہ کہ جب بھی وہ منی سے بات کرتا اس سے کہتا کہ تم اپنے سسرال کبھی نہ جانا۔ بنگال کے دیہی گھرانوں میں لڑکیاں بچپن سے ہی شادی اور سسرال جیسے الفاظ کا مفہوم جانتی ہیں جب کہ شہری علاقوں میں والدین بچوں کے سامنے اس قسم کی گفتگو نہیں کرتے یہی وجہہ ہے کہ منی رحمت کی ان باتوں کا مفہوم نہیں سمجھتی۔لیکن منی کے لئے کسی بات کا جواب نہ دینا ممکن نہ تھا وہ پلٹ کر کابلی والا سے کہتی کہ کیا تم اپنے سسرال کو جاؤ گے''؟ کابلی والا مارنے کے انداز میں اپنے ہاتھ کا مکا بناتا اور کہنے لگتا کہ میں اپنے سسرال والوں کو خوب ماروں گا۔ مار کھانے والے سسر کی حالت کا اندازہ کرتی ہوئی منی زور زور سے ہنسنے لگتی۔

یہ خزاں کا ابتدائی موسم تھا اور ماضی میں اسی زمانے میں بادشاہ جنگیں لڑنے نکلتے تھے۔شخصی طور پر میں کلکتہ کے باہر کبھی نہیں گیا تھا صرف کتابوں میں دوسرے ممالک کے حالات پڑھے تھے۔ کابلی والا جب بھی آتا اپنی ٹوٹی پھوٹی بنگالی میں اپنے ملک افغانستان کے حالات سنانے لگتا کہ وہاں کے لوگوں کا رہن سہن کیسا ہے۔افغانستان کس طرح پہاڑوں کے گرد گھرا ملک ہے۔ پٹھانوں کی زندگی کیسے ہوتی ہے اور کس طرح لوگ اونٹوں پر پیدل اور قافلے کی شکل میں تجارتی سامان لئے ایک علاقے سے دوسرے علاقے کا سفر کرتے ہیں۔ یہ سب باتیں سن کر مجھے عجیب سے محسوس ہوتا۔منی کی ماں ڈرپوک تھی۔ ذرا سی آواز پر چونک جاتی کہ کہیں کوئی چور یا ڈاکو حملہ آور تو نہیں ہوئے جب کہ اسے پتہ نہیں تھا کہ یہ دنیا طرح طرح کے عجائبات سے بھری ہے۔وہ کابلی والا اور منی کی دوستی سے اب بھی خوفزدہ تھی اور مجھ سے کہتی رہتی کہ وہ اس پر نظر رکھے۔ میں اسے اطمینان دلانے کی کوشش کرتا تو وہ کہتی کہ بچوں کے اغوا کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ممکن ہے کہ یہ افغانی اپنی بیٹی کو اغوا کر کے افغانستان لے جائے گا اور اس سے گداگری کرائے گا۔ جب کہ یہ ناممکن تھا کہ رحمت منی کو دور افغانستان لے جائے۔میں یہ بات جانتا تھا لیکن منی کی ماں کو سمجھا نہیں سکا اور نہ ہی میں نے کابلی والا کو منع کیا کہ وہ منی سے نہ ملے۔

ہر سال جنوری یا فروری کے مہینے میں رحمت اپنے وطن جاتا اور اپنے افراد خاندان سے ملاقات کر آتا۔اس دوران اس نے ایک پیسہ جمع کرنے والے کو کہہ دیا تھا کہ اس کے بقایا جات وصول کرتا رہے۔کابلی والا سارا شہر گھوما کرتا تھا لیکن پھر بھی اس کے پاس اتنا وقت ہوتا تھا کہ وہ منی سے ملاقات کر ہی لیتا تھا۔جس دن وہ صبح نہیں آتا تھا تو شام کو ضرور آتا تھا۔دونوں کی دوستی گہری ہوتی گئی اور تعجب خیز بھی۔شام کے وقت جب وہ اپنے اونچے پورے قد میں عجیب وغریب انداز سے میری بیٹی کے بازو بیٹھتا تو مجھے بھی کچھ ڈر اور خوف محسوس ہونے لگتا۔لیکن کابلی والا کی آمد پر جیسے ہی منی ہنستے کھیلتے باہر آتی اور اس کا مسکراہٹ کے ساتھ استقبال کرتی تو میرا خوف کچھ کم ہوجاتا۔ سردیوں کے اختتام پر ایک صبح جب میں اپنے کمرے میں بیٹھا کچھ کاغذات کا مطالعہ کر رہا تھا سردیاں کافی شدید تھیں صبح چہل قدمی کرنے والے اپنی چہل قدمی ختم کر چکے تھے اچانک میں نے گلی میں کچھ آوازیں سنیں۔ میں نے جھانک کر دیکھا تو دو پولیس والے رحمت کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں ڈالے اسے لئے جارہے تھے۔ان کے پیچھے لوگوں کا ایک ہجوم تھا۔کابلی والا کے

کپڑے خون آلود تھے۔اور ایک پولیس والے کے ہاتھ میں خون کے چھینٹے لگا ہوا چاقو تھا۔ میں فوری باہر آیا اور پولیس والوں کے ساتھ چلتے ہوئے معاملہ دریافت کرنے لگا کہ آخر ماجرا کیا ہے؟ پولیس والوں اور رحمت سے ملی تفصیلات سے پتہ چلا کہ اس کے ایک پڑوسی نے رحمت سے رامپوری شال قرض پر لی تھی۔اور رحمت کے مطالبہ کرنے پر بھی وہ شال کی رقم ادا نہیں کر رہا تھا۔ دونوں کے درمیان اس بات پر جھگڑا شروع ہوگیا اور غصہ میں رحمت نے چاقو نکال کر اس شخص پر حملہ کر دیا۔رحمت اس بے ایمان شخص کو گالیاں دے رہا تھا کہ اسی دوران منی اپنے گھر سے نکل کر باہر آ گئی اور فوری او کابلی والا او کابلی والا کہہ کر چلانے لگی۔فوری رحمت کے چہرے سے غصے کے آثار چلے گئے اور چہرے پر خوشی کے آثار آ گئے ۔ چونکہ اس دن اس کے گلے میں خشک میوے بیچنے کا تھیلا نہیں تھا اس لئے ان دونوں کے درمیان روزانہ ہونے والی بات چیت نہیں ہوئی۔ تاہم منی معمول کے مطابق پوچھ بیٹھی کہ کیا تم اپنے سسرال جاؤ گے؟

رحمت ہنستے ہوئے کہنے لگا'' تم نے ٹھیک کہا اب میں وہیں جا رہا ہوں''۔ منی اس کا جواب نہیں سمجھ سکی تو اس نے اپنے ہاتھ میں لگی ہتھکڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ'' اگر میرے ہاتھ بندھے نہ ہوتے تو میں اپنے سسر کو ضرور پیٹتا۔''

رحمت پر چاقو سے حملہ کرنے کے سنگین الزامات عائد کرتے ہوئے اسے کئی سال کی سزا کے ساتھ جیل میں ڈال دیا گیا۔ کچھ دن یوں ہی گذر گئے اور معصوم منی کابلی والا کو بھولنے لگی۔اس کی جگہ ایک اور شخص نبی نے لے لی تھی ۔منی جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی اس نے اپنے تمام مرد دوستوں سے دوستی ترک کر دی اور اپنی ہم عمر لڑکیوں سے اس کے دوستی ہوتی گئی وہ اب مجھ سے بھی بہت کم بات کرتی تھی۔

کئی برس گذر گئے۔ایک مرتبہ پھر سے خزاں کا موسم آیا۔منی بڑی ہوگئی تھی' اس کی شادی طے کر دی گئی تھی۔درگا پوجا کی چھٹیوں میں اس کی شادی ہونی تھی۔اب وقت آ گیا تھا کہ منی اپنے ماں باپ کے گھر سے وداع ہو اور اپنے سسرال چلی جائے۔گھر میں شادی کی گہما گہمی تھی' لوگوں کا آنا جانا لگا ہوا تھا۔ گھر کے آنگن میں منڈپ ڈالا گیا تھا اور مہمانوں کے لئے ڈیرے کا انتظام کیا گیا تھا۔گھر کو خصوصی روشنیوں سے چمکایا گیا تھا۔ گھر میں ہر طرف شادی کی رونقیں تھیں۔ میں بھی اپنے کمرے میں شادی کے حساب کتاب میں لگا ہوا تھا کہ اچانک رحمت کمرے میں داخل ہوا''سلام ساب''۔شروع میں میں اسے پہچان نہیں سکا۔اس کے لباس اور چال ڈھال میں کافی فرق آ گیا تھا۔میں اس کی مسکراہٹ سے اسے پہچان گیا۔میں نے اس کے سلام کا جواب دیا اور اس سے دریافت کیا کہ اتنے دن ہوگئے کہاں رہ گئے تھے۔اس نے جواب دیا کہ کل شام ہی اسے جیل سے رہا کیا گیا تھا۔یہ سنتے ہی میں سکتے میں رہ گیا۔میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی کی شادی جیسے مبارک موقع پر کوئی قیدی اس کے گھر میں اس حال میں داخل ہو۔میں نے کہا کہ ہمارے گھر میں شادی کی تقریب ہے' میں اس سلسلے میں کافی مصروف ہوں' بہتر ہوگا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔یہ سن کر وہ واپس جانے لگا۔ دروازے کے قریب جا کر وہ رک گیا اور پلٹ کر مجھ سے پوچھنے لگا کیا میں ایک مرتبہ منی کو دیکھ سکتا ہوں۔اسے بچپن کی وہ منی یاد تھی

جو اس کی آمد کی اطلاع پا کر چیختی چلاتی آتی کہ کابلی والا او کابلی والا۔ دونوں کے ماضی کے خوشگوار رشتے ہی اسے یاد تھے۔ پرانی باتوں کو یاد رکھتے ہوئے رحمت نے منی کے لئے کشمش اور انگوروں کا ایک ڈبہ بھی ساتھ لایا تھا۔ شائد یہ اس نے اپنے کسی اپنے افغان دوست سے خریدے تھے ہونگے کیوں کہ اب تو اس کے ساتھ اپنا ساز و سامان کچھ نہ تھا۔ میں نے دوبارہ اس سے کہا کہ ہمارے گھر میں تہوار کی تقاریب چل رہی ہیں کوئی تم سے ملنے نہیں آ سکتا۔ وہ یہ سن کر مایوس ہو گیا اور مجھ پر تاسف کی نظر سے دیکھنے لگا پھر وہ خدا حافظ کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔ مجھے اس بات کا کافی افسوس ہوا اور میں سوچنے لگا کہ کیا میں اسے دوبارہ بلاؤں۔ تب ہی میں نے دیکھا کہ وہ دوبارہ پلٹ کر واپس آ رہا ہے۔ وہ میرے قریب آیا اور کہنے لگا۔ ''میں آپ کی چھوٹی بچی کے لئے یہ انگور اور کشمش لایا ہوں امید کرتا ہوں کہ آپ اسے دے دیں گے۔ میں نے اس سے کشمش اور انگور کا ڈبہ لے لیا اور اسے کچھ رقم دینے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اس نے میرے ہاتھ پکڑ لئے اور کہا کہ ساب آپ کافی رحم دل انسان ہیں۔ میں آپ کی رحم دلی کو کبھی نہیں بھولوں گا لیکن اس دفعہ آپ ان چیزوں کے لئے رقم ادا نہ کریں۔ میں آپ کے گھر اس لئے آتا ہوں کہ آپ کی بچی کی طرح میری بھی ایک بچی ہے میں آپ کی بچی کو دیکھتا ہوں تو اپنی بچی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے' میں آپ کے گھر کاروبار کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنی بچی کی یاد تازہ کرنے کے لئے آیا کرتا تھا۔ اس نے اپنے جیب سے ایک پرانا مڑا ہوا کاغذ نکالا اور کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔ اس کاغذ پر ہاتھ کی ایک تصویر بنی تھی جو اس کی بیٹی کے ہاتھ کی تھی۔ اس تصویر کو وہ بہت عزیز رکھتا تھا۔ اور اسے دیکھ کر دل بہلاتا رہتا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر میرا دل بھر آیا اور اندازہ ہوا کہ وہ صرف ایک افغان تاجر نہیں اور نہ ہی میں ایک بنگالی گھرانے کا فرد بلکہ ہم دونوں میں ایک قدر مشترک تھی کہ ہم دونوں ایک ایک بیٹی کے باپ تھے۔ کاغذ پر اس کی بچی کے ہاتھ کی تصویر دیکھ کر مجھے اپنی منی یاد آ گئی۔ میں نے فوری گھر میں اطلاع دی اور منی کو اسٹڈی روم میں لانے کے لئے کہا۔ کئی خواتین نے اس بات پر اعتراض بھی کیا۔ لیکن میں نہیں مانا۔ اپنے شادی کے لباس میں مختلف زیوارات پہنے منی کمرے میں آئی اور میرے بازو آ کر کھڑی ہو گئی۔ چھوٹی منی کو دیکھ کر آپس میں مذاق کرنے والے یہ دونوں دوست ایک لمحے کے لئے چپ ہو گئے۔ تب کابلی والا نے ہی بھرے بھرے لہجے میں کہا ''منی کیا تم واقعی سسرال جا رہی ہو''؟ منی کو اب اندازہ ہوا کہ سسرال کیا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ بچپن کا جواب دہرا نہیں سکی۔ رحمت کی باتیں سن کر وہ شرما گئی اور پلٹ کر چلی گئی۔ منی کے جانے کے بعد رحمت کو بھی اندازہ ہو گیا کہ اس کی بیٹی بھی افغانستان میں اتنی ہی بڑی ہو گئی ہو گی۔ اس کی شادی ہوئی یا نہیں اس کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ گھر میں شادی کی دھوم دھام جاری تھی۔ اور رحمت خیالوں میں گم تھا۔ میں نے شادی کے اخراجات میں کمی کی اور رحمت کو ایک بڑی رقم دی اور اس سے کہا کہ وہ فوری اپنے وطن کی جانب سفر کرے اور گھر جا کر اپنی بیٹی کی شادی بھی دھوم دھام سے کرے۔ رقم کی کمی سے منی کی شادی میں باجے اور روشنیوں کی کمی ہو گئی تھی لیکن رحمت کی مدد کرتے ہوئے مجھے جو مسرت حاصل ہوئی تھی اس کا اندازہ مجھے ہی تھا!!!!!

☆☆☆

ڈاکٹر فاروق شکیلؔ
حیدرآباد

# غزلیں

کہاں سے لائے کوئی اب وہ پیار کا لہجہ
بدل گیا جو زمانہ بدل گیا لہجہ
خلوص اور محبت کے رنگ چھین لئے
ہمارے دَور نے بے رنگ کردیا لہجہ
رہوں جو چُپ کوئی اندر سے نوچتا ہے مجھے
جو بولتا ہوں تو ہوجاتا ہے کھرا لہجہ
یقین ہے کہ مجھے اجنبی بنادے گا
اَنا کو اوڑھ کے نکلے گا جب مرا لہجہ
شگاف پڑگیا دیوارِ جاں میں چپکے سے
جب اجنبی سا لگا اپنے بھا ئی کا لہجہ
ہم اپنے دَور کے لہجے پہننے والے ہیں
کہاں سے لائیں گے ہم لوگ میرؔ کا لہجہ
شکیلؔ ہم نے دکھائے ہیں زخم اندر کے
ملا ہے جب کوئی مرہم بھرا ہوا لہجہ

oOo

اُتر کے ذہن سے آتے ہیں لفظ کاغذ پر
غزل کا جسم بناتے ہیں لفظ کاغذ پر
مٹھاس اوڑھے جب آتے ہیں لفظ کاغذ پر
تعلقات بڑھاتے ہیں لفظ کاغذ پر
ہر ایک جذبے کو دیتے ہیں روشنی کا بدن
چراغ دل کا جلاتے ہیں ہیں لفظ کاغذ پر
نہ جانے کون سا موسم ہے وادیٔ جاں میں
غموں کی فصل اُگاتے ہیں لفظ کاغذ پر
نگاہ جب کوئی منظر کو جذب کرتی ہے
ثنا کے پھول کِھلاتے ہیں لفظ کاغذ پر
دھواں دھواں نظر آتی ہیں جب بھی تحریریں
ضرور آگ لگاتے ہیں لفظ کاغذ پر
جھنجھوڑ دیتے ہیں اندر کے آدمی کو شکیلؔ
سچائی پی کے جب آتے ہیں لفظ کاغذ پر

oOo

اقبال شیدائی
ورنگل

# غزلیں

وہ مشکلوں کو سدا آزمایا کرتا تھا
زمینِ خشک میں بھی گُل کِھلایا کرتا تھا
وہ لے کے ہاتھ میں تلوار آج پھرتا ہے
محبتوں کے دیئے جو جلا کرتا تھا
گھنے درخت کو کاٹا ہے اک ہجوم نے آج
مسافروں کے لئے کل جو سایہ کرتا تھا
اسے تو ماردیا خود اسی کے لوگوں نے
جو دوسروں کے سدا کام آیا کرتا تھا
ہمارے عفو و کرم پر وہ شرمسار سا ہے
جو بات بات پہ ہم کو ڈرایا کرتا تھا
بھٹک رہا ہے وہی واہموں کے جنگل میں
جو سب کو راستہ حق کا دکھایا کرتا تھا
نہ جانے کیا ہوا مدت سے لاپتہ سا ہے
وہ ہم سے ملنے ہر اتوار آیا کرتا تھا
وہ ایک طفل سے شیدائی کھا گیا ہے مات
بڑے بڑوں کو جو اکثر ہرایا کرتا تھا
یہ کیسے مُڑ گیا شیدائی جانب مقتل
''یہ راستہ تو کہیں اور جایا کرتا تھا''

oOo

ہم سمجھتے ہیں ہمارے حق میں بہتر ہوگیا
غم میں اوروں کے تڑپنا ہی مقدّر ہوگیا
دُشمنِ جانی مرا خود آج دلبر ہوگیا
جس کی تھی تسخیر ناممکن مسخّر ہوگیا
آپ ناواقف ہیں اس سے تجربہ میرا ہے یہ
پھیل کر اشکِ ندامت اک سمندر ہوگیا
اُس نے لے لی ہے سپاری مرے اک مدّاح سے
قتل پر میرے سُنا ہے وہ مقرّر ہوگیا
یہ ہوا اکثر کرشمہ یاد جب تم آگئے
روح برقا سی گئی سینہ منوّر ہوگیا
رہنمائی کی ہے خود امواجِ قلزم نے مری
مرحبا! اس معرکے میں میں مظفّر ہوگیا
رنگ بدلا بخت نے کچھ اس ادا سے دفعتاً
تھا جو کل گھردار والا آج بے گھر ہوگیا
راستے کُھلنے لگے اپنے لئے ہر موڑ پر
ہم چلے جس سمت بھی دیوار میں دَر ہوگیا
عمر میں نے کاٹ دی شیدائی جس ماحول میں
آپ کو جینا اُسی میں کیسے دوبھر ہوگیا

oOo

# غزلیں

زعیم ذُومرّہ

مسلسل ظلم سہہ کر جی رہا ہوں
نئے اس دور کا اک سانحہ ہوں

مرے دشمن مرے سر پر کھڑے ہیں
میں گہری نیند میں سویا ہوا ہوں

وہ مجھ پر ظلم ڈھاتے جارہے ہیں
میں کہتا جارہا ہوں بے خطا ہوں

ہیں قاتل اور کاذب سب مزے میں
میں صادق ہو کے سولی پر چڑھا ہوں

مری خوشیوں سے وہ لپٹے ہوئے ہیں
غموں سے اُن کے میں لپٹا ہوا ہوں

بجھا پایا نہ باطل جس کو اب تک
میں حق کی راہ کا ایسا دِیا ہوں

ادا ہوتا ہیں حق بندگی کا
عمل سے دور ہوں پچھتا رہا ہوں

گناہوں کا یہ کفّارہ ہوں شاید
خوشی سے غم کو سہتا جارہا ہوں

مرے چہرے پہ جو لکھا ہے پڑھ لو
یہ مت پوچھو کہ میں ہوں کون کیا ہوں

زعیم اللہ کے فضل و کرم سے
سدا حق پر ہی میں چلتا رہا ہوں

oOo

اجمیری ہوٹل
عثمان ساگر (گنڈی پیٹ)' حیدرآباد

یوں زندگی کے ساتھ ہماری بنی رہی
خوشیوں کے ساتھ غم سے بھی وابستگی رہی

حق بندگی کا مجھ سے ادا ہی نہ ہوسکا
ہر بار رب کے آگے یہ شرمندگی رہی

دولت کی لت نے چھین لی چہرے سے دلکشی
پہلی سی آپ میں وہ کہاں سادگی رہی

پہچان ہی نہ پائی مجھے آج تک بھی وہ
''اک عمر ساتھ ساتھ مرے زندگی رہی''

سب لوگ دنگ رہ گئے چہرے کو دیکھ کر
مرنے کے بعد چہرے پہ وہ تازگی رہی

لگتا ہے یوں کہ سوئے ہیں اب جاگ جائیں گے
پاکر جدائی جسم سے یوں زندگی رہی

الفاظ کے برتنے کا فن ہی نہ آسکا
تب ہی تو مجھ سے دور مری شاعری رہی

رَب مہرباں رہا ہے مرے حال پر زعیم
ہر کشمکش سے پا ک مری زندگی رہی

oOo

ڈاکٹر سمیر کبیر
B/12، فرازاپارٹمنٹ،
جعفرنگر، ناگپور 013 440 (مہاراشٹرا)

# غزلیں

کسی کی یاد کیوں ایسے رہی ہے
کہ خوشبو پھول کے جیسی رہی ہے
دیار اُجڑے ہوئے خود کہہ رہے ہیں
یہاں پہلے کوئی بستی رہی ہے
کسی کی اب کوئی سنتا نہیں ہے
وگرنہ بات تو ہوتی رہی ہے
کہاں ملتا ہے سب کو ایک موسم
کبھی بارش کبھی گرمی رہی ہے
مرے محور پہ شاہد چاند ٹھہرا
مرے صحرا میں شادابی رہی ہے
کسی کی چشمِ تر میں ہم نے دیکھا
کہ ایک دنیا وہاں ٹھیری رہی ہے

oOo

کوئی صورت کتاب سے نکلے
یاد سوکھے گلاب سے نکلے
میری آنکھیں ہیں منتظر ایسی
کب وہ چہرہ نقاب سے نکلے
کتنے موتی ہیں اس کے آنچل میں
کتنی کرنیں حجاب سے نکلے
چاند اُترا تھا شب کو آنگن میں
نیند ٹوٹے تو خواب سے نکلے
وہ میری پیاس کو بجھادے گا
ایک قطرہ جو آب سے نکلے

oOo